اُردو میں میراجی شناسی کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ

[تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو]

مقالہ نگار:
ساجدہ پروین
لیکچرار اُردو
گورنمنٹ کالج برائے خواتین، شورکوٹ
رول نمبر:AB833106
رجسٹریشن نمبر:95-PJG-1889
فون نمبر:0333-6760762

نگرانِ مقالہ:
ڈاکٹر ناصر عباس نیّر
شعبۂ اُردو
اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی،
لاہور

شعبۂ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ سال ۲۰۱۴ء

ساجدہ پروین

جدید ادب (جرمنی)

میراجی نمبر

جدید ادب، سرور اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا اردو کا اہم ادبی جریدہ ہے۔ اس کے مدیر حیدر قریشی صاحب ہیں یہ بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا ادبی جریدہ ہے۔ جدید ادب کا شمارہ ۱۹ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء) میراجی نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ تمام علمی و ادبی حلقوں نے حیدر قریشی صاحب کی اس کاوش کو سراہا اور اس کی اشاعت کو تاریخ اردو ادب کا ایک اہم اور مؤقر واقعہ قرار دیا۔ حیدر قریشی صاحب نے ۶۰۰ صفحات کا ضخیم ''جدید ادب'' کا میراجی نمبر شائع کر کے میراجی کی اہمیت کو عالمی سطح پر اُجاگر کیا ہے اور میراجی کا آموختہ کروا کر ازسرِ نو ان کے شعری و نثری سرمایے پر غور و فکر کرنے کی دعوتِ عام دی ہے۔ انہوں نے میراجی نمبر کو مدیرانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے مختلف اور متنوع گوشوں میں ترتیب دیا ہے۔ میراجی نمبر کا آغاز حیدر قریشی کی ''گفتگو'' سے ہوتا ہے۔ ان کی ''گفتگو'' جدید اردو ادب سے ان کے تعلق اور میراجی سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کی آئینہ دار ہے۔

وہ بجا طور پر فرماتے ہیں:

> ''کسی شاعر اور ادیب کے مقام کا تعین اس کی تخلیقات اور نگارشات کے ذریعے ہی کیا جانا چاہیے۔ اگر اس میں مذہبی و مسلکی معاملات کو بنیاد بنا کر کسی تخلیق کار کا مقام طے کرنے کے منفی رویہ کو فروغ دیا جانے لگا تو اس سے اردو ادب میں طالبانی رویہ فروغ پائے گا جو ادب کے لیے کسی زہر سے کم نہیں ہے۔۔۔ میراجی کو نظر انداز کیے جانے میں ہمارے معاشرے کی مروج اور دہرے معیار کی حامل اخلاقیات کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے۔۔۔ ہم لوگ اپنے معاشرے کے دوہرے معیار کے عین مطابق ظاہری اخلاقیات کے تحت آنے والے کسی عیب پر رک کر رہ جاتے ہیں اور پھر اس تخلیق کار کا سارا ادبی کام پسِ پشت چلا جاتا ہے۔ میراجی بڑی حد تک اس منفی رویے کا شکار ہوئے ہیں۔ رہی سہی کسر ان کے ان دوستوں اور ''کرم فرماؤں'' نے پوری کر دی جنھوں نے میراجی کے فن پر توجہ دینے کی بجائے ان کی شخصیت کو مزید افسانوی بنا دیا۔ بے شک ان کی شخصیت میں ایک انوکھی سحر انگیزی تھی، یاروں کی افسانہ طرازی نے میراجی کے گرد ایسا ہالہ (جالا) بن دیا کہ قاری ان کی تخلیقات سے بالکل غافل ہو گیا۔''(۴۷)

انہیں امید واثق ہے کہ اس نمبر کی اشاعت کے بعد میراجی کے مطالعہ کا رجحان زیادہ ہوگا۔ جیسے جیسے میراجی کو زیادہ پڑھا جائے گا ویسے ویسے ان کی تفہیم کے امکانات روشن ہوں گے۔فیض اور راشد سے میراجی کا تقابل خیال افروز ہے۔ بلاشبہ یہ شمارہ میراجی پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

حیدر قریشی کی ''گفتگو'' کے بعد میراجی کے سوانحی خاکے کو ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنے احاطۂ تحریر میں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔اس کے بعد ہانی السعید نے میراجی پر اب تک ہونے والے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے ن۔م۔راشد کا ایک خط میراجی کے نام اور اختر الایمان کا ایک خط ڈاکٹر رشید امجد کے نام بھی شاملِ اشاعت ہے۔ یہ خطوط میراجی کو سمجھنے اور ان کے مقام ومرتبے کے تعین میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

ابتدائی حصے کے بعد اس شمارے کو ۹ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ میراجی شناسی اور وزیر آغا
۲۔ میراجی کی شخصیت اور شاعری
۳۔ میراجی کی تنقید اور ترجمہ نگاری
۴۔ میراجی، نئے لکھنے والوں کی نظر میں
۵۔ میراجی کی شاعری کا انتخاب
۶۔ میراجی کی نثر کا انتخاب
۷۔ میراجی کو منظوم خراجِ محبت
۸۔ مختلف زبانوں میں میراجی کی نظموں کے تراجم
۹۔ انتظاریہ

پہلا حصہ ''میراجی شناسی اور وزیر آغا'' کے عنوان سے ہے اس میں کل چھ مضامین ہیں۔ان میں سے پانچ مضامین ڈاکٹر وزیر آغا کے جبکہ ایک مضمون طارق حبیب کا ڈاکٹر وزیر آغا کی میراجی شناسی کے حوالے سے ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے میراجی سے متعلق مضامین مختلف مگر نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ان مضامین کا تعلق میراجی کی ذاتیات سے بالکل نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنی پوری توجہ میراجی کے فن اور فکر پر مرکوز رکھی ہے۔ یہ مضامین بعد کے لکھنے والوں کے لیے ماٰخذ کا درجہ رکھتے ہیں اور کئی ایک راہنما اصول بھی مہیا کرتے ہیں۔ میراجی فہمی کے ضمن میں یہ مضامین بہت اہم ہیں۔

پہلا مضمون ''میراجی۔۔۔دھرتی پوجا کی ایک مثال'' ہے یہ مضمون نہ صرف میراجی کی فکر کو سمجھنے کے حوالے سے اہم ہے، بلکہ قدیم ہندوستانی طرزِ معاشرت وثقافت، اسلوبِ حیات اور علامات کے بنیادی تصور کو سمجھنے میں بھی معاون ہے۔اس مضمون کو تحریر کرتے وقت ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ اُصول مدنظر رکھا ہے کہ پہلے میراجی کی فکر سے میراجی کی تخلیقی شخصیت کی طرف سفر کیا جائے۔ پھر واپس میراجی کی فکر تک۔اس مضمون میں دھرتی پوجا سے مراد جذبے اور دھرتی کا وہ روحانی ارتقاء ہے، جو فنونِ لطیفہ کے پیکروں میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔

آغازِ مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا زمین سے وابستہ شاعروں نظیر، آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، چکبست، محروم، محمد اقبال اور راشد کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بات واضح کرتے ہیں کہ محولہ بالا شعراء میں دھرتی سے وابستگی کی چند ایک مثالیں تو ملتی ہیں لیکن ان کی کوئی واضح Commitment اور کوئی گہری لگن دھرتی سے، اس کی رسوم سے اور اس کے تہذیبی پس منظر سے ثابت نہیں ہوتی۔میراجی نے اپنی روح کو دھرتی کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

وزیر آغا نے میراجی کے یہاں ''میلا رمے'' کے ابہام کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات کی نفی کی ہے۔انہوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب کے پس منظر اور ویشنومت فلاسفی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے میراجی کے یہاں استعمال ہونے والی اساطیری، قدیم دیومالائی اور ویشنومت کی تہذیبی اصطلاحات اور تلمیحات کا ذکر بھی کیا ہے۔ان سے میراجی کی اس قدیم تہذیبی پس منظر سے وابستگی کا گہرا ثبوت ملتا ہے۔میراجی کو تہذیبی سطح پر سمجھنے کے لیے یہ مضمون بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون میراجی پر پڑے ہوئے افسانوی پردوں کو چاک کر کے ان کی اصلیت تک ہماری رسائی ممکن بناتا ہے۔

اس مضمون کا تفصیلی مطالعہ ''میراجی شخصیت اور فن'' مرتبہ کمار پاشی کے ضمن میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا مضمون ''میراجی اور اردو شاعری کا مزاج'' کے عنوان سے ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اردو شاعری کا مزاج'' میں گیت، غزل اور نظم کے تہذیبی حوالے سے تفصیلی مطالعے کے بعد ''نئی نظم'' کی وضاحت کی ہے۔ یہ وضاحت میراجی اور آزاد نظم دونوں کی تفہیم میں ممد ومعاون ہے۔ان کے خیال میں نئی نظم کا اصل مزاج اور سفر خارج سے داخل کی طرف ہے اور اس مزاج کے سب سے بڑے علمبردار میراجی ہیں۔انہوں نے اقبال کے بعد اردو نظم کو دو سطحوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی سطح اقبال سے متاثرین کی ہے اور دوسری سطح داخلیت پسندوں کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ دونوں سطحیں باطن اور خارج کے ربط باہم ہی کو اُجاگر کرتی ہیں، فرق صرف جہت کا ہے۔ پہلی سطح باطن کی دنیا کو خارج کی اشیا یا موضوعات سے منسلک کرنے کی ایک کاوش ہے۔۔۔دوسری سطح خارج کی دنیا کو باطن سے منسلک کرتی ہے۔۔۔نظم کی اصل جہت باہر سے

اندر کی طرف ہے۔۔۔جہت کا یہ فرق موضوع پر بھی اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے۔ باہر کی طرف بڑھنے میں امید، رجائیت، تحرک اور گونج کی صفات پیدا ہوتی ہیں، جب کہ اندر کی طرف آنے میں مدافعتی انداز، یاس، کسک، خوف، دبے پاؤں چلنے کا انداز اور لہجے کی لطافت اور لوچ جنم لیتا ہے۔۔۔اندر کو آنے والا ذات اور نسل، جبلت اور ثقافتی بنیادوں سے منسلک ہو کر گویا انسان کے ماضی کی طرف لوٹتا ہے۔''(۴۸)

میراجی کا سفر سراسر اندر کی طرف تھا۔یعنی مدافعتی انداز، یاس، کسک، خوف اور دبے پاؤں چلنے کا انداز۔

ڈاکٹر وزیر آغا خارج اور داخل کے سفر کو قوس کے سفر سے تعبیر کرتے ہیں۔قوس کا پہلا نصف خارجی اور دوسرا نصف داخلی جہت کو واضح کرتا ہے۔میراجی کی نظم ترقی پسند رویے کے بھی منافی ہے۔ان کی نظم داخلی سطح پر اظہار کی معراج ہے:

''نظم کی اس جہت نے میراجی کے ہاں باطن کی دنیا کو برانگیختہ کر دیا۔خود انسانی زندگی میں جب جوانی کا زور ٹوٹتا ہے۔تو آنے والی موت کے سائے نظر آنے لگتے ہیں۔۔۔موت کا خوف ایک ذہنی خلفشار کو جنم دے دیتا ہے۔نظم میں یہی چیز جبلتِ مرگ کی شدت کا اندازہ ان بہت سے مظاہر سے ہوتا ہے۔جو موت کی علامتیں بن کر نمودار ہوتے ہیں، مثلاً جنگل، تیرگی، بھوت، ڈائن، سمندر، غار، خون، سایہ یہ تمام چیزیں روشنی کے بتدریج ماند پڑنے پر اپنے سارے بہیمانہ نقوش کے ساتھ اجاگر ہوتی ہیں۔میراجی کی نظم میں یہ سب علامتیں، زوال کی جہت کو نمایاں کر کے ظاہر سے باطن کی طرف شاعر کی پیش قدمی کو سامنے لاتی ہیں۔''(۴۹)

ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی وضاحت کے ساتھ میراجی کے ہاں حیات و موت کی نفسیاتی کش مکش کو بیان کیا ہے۔وہ میراجی کے ہاں جنسی موضوع کو نفسیاتی ضرورت کے تابع قرار دیتے ہیں۔وہ میراجی کے ہاں تہذیبی سطح پر حب الوطنی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔وشنومت کی طرف میراجی کے تعلق خاطر پر روشنی ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میراجی کے ہاں رادھا کرشن اور دوسرے تہذیبی عناصر جنسی علامات میں ڈھل کر ظاہر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے کہ میراجی نے خارجی مظاہر سے اپنا تعلق بھی شروع سے آخر تک قائم رکھا ہے۔وہ جسمانی طور پر متحرک رہے ہیں۔انہوں نے ''زندگی'' کے قریب آ کر خود تجربات حاصل کیے۔ان کے ہاں خارجی اور داخلی دونوں سطح پر زندگی کا تصادم اُبھرا۔''تحفظِ ذات'' کا احساس کہیں بھی ختم نہیں ہوتا۔

ان کا مؤقف ہے کہ میراجی صرف حیات، روشنی اور امید کا ہی شاعر نہیں اور نہ ہی صرف موت، تاریکی اور مایوسی کا علمبردار۔وہ تو روشنی اور تاریکی کا ایک مضبوط سنگم ہے۔میراجی داخلیت پسندی کے اعتبار سے ایک کامیاب اور دیرپا شاعر ہے۔اس کے اثرات بعد میں آنے والے شعراء کی ایک پوری نسل پر موجود ہیں۔یہ بات میراجی اور آزاد نظم دونوں کے لیے نیک فال ہے۔

تیسرا مضمون ''میراجی کا عرفانِ ذات'' ہے۔یہ مضمون میراجی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

مضمون کے شروع ہی میں ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''ہر آبی طوفان کی ایک اپنی آنکھ ہوتی ہے۔جس کے گرد ہوائیں چنگھاڑتی پھرتی ہیں، لیکن آنکھ کے اندر جوگی کے استھان کا سا سکوت قائم رہتا ہے۔مجھے جب کبھی میراجی کا خیال آیا، تو اس کے ساتھ ہی آبی طوفان کا منظر بھی میری نگاہوں میں گھوم گیا اور میں نے سوچا یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ ہم طوفان کو دیکھنے میں اس قدر منہمک ہوں کہ اس ''آنکھ'' کو دیکھ ہی نہ سکیں۔جو اس طوفان کا مرکز ہے اور جس میں عارفانہ سکوت کی سی کیفیت سدا قائم رہتی ہے۔''(۵۰)

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ میراجی کے ساتھ ''عرفان'' کی بات کی جائے تو طبیعتوں میں ایک خاص قسم کا مجادلہ شروع ہو جاتا ہے۔اس کی بڑی وجہ وہ افسانے ہیں جو دوست احباب نے میراجی کے ساتھ وابستہ کر رکھے ہیں۔اس کی ذمہ داری خود میراجی پر بھی عاید ہوتی ہے کیونکہ میراجی نے خود بھی یہ کبھی نہیں کہا کہ اس کے دوست احباب نے غلط بیانی سے کام لیا۔ان کے دوستوں نے انہیں افسانہ بنانا چاہا اور وہ بلا تامل افسانہ بنتے چلے گئے۔ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی مؤقف ہے کہ میرا سین سے میراجی کے عشق کی داستان ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔انہوں نے جان بوجھ کر خود کو بہروپیے کے روپ میں پیش کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا سوال کرتے ہیں کہ اس روپ میں کس قسم کی ہستی چھپی بیٹھی تھی؟

''اگر ابتدائی تمثیل کو ملحوظ رکھ کر بات کی جائے تو پھر یہ سوال کہ کیا آبی طوفان کی آنکھ محض اپنے اردگرد کا تلاطم پیش کر رہی تھی۔یا اس کا کوئی منفرد زاویہ نگاہ بھی تھا؟''(۵۱)

یہ سوال بہت اہم ہے۔وہ خود ہی اس سوال کا جواب بھی دیتے ہیں کہ:

''میراجی کے ہاں خارج اور باطن کا رشتہ ناظر و منظور کے رشتہ کی صورت اختیار کر گیا تھا اور میراجی کی شخصیت ایک بیدار آنکھ کی طرح موجود کے مدوجزر کو دیکھنے لگی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زاویۂ نگاہ بھگتی تحریک کے اثرات کا ثمر تھا اور بعض اوقات قطعاً غیر شعوری طور پر

مظاہر کو مایا یا سراب بھی قرار دے ڈالتا تھا۔''(۵۲)

ان کے مطابق میرا جی نے دنیا اور زندگی کے ہر ہر پہلو کا مطالعہ شوق سے کیا۔ عملِ تغیر انہیں بہت مرغوب تھا۔ وہ تنہائی عمل میں کسی کی مداخلت اور مشارکت قبول نہ کرتا تھا۔ اس کے باطن میں ایک نئی دنیا آباد تھی جو عرفانِ ذات کی متلاشی تھی۔ میرا جی نے تو ایک بھگت کی طرح اپنی ''چھوٹی میں'' کو ''بڑی میں'' کے تابع کیا۔ نہ صوفی کی طرح اسے ذاتِ واحد میں ضم کر دیا بلکہ اسے اثباتِ ذات کا مفہوم عطا کر کے عرفان کی ایک نئی سطح دریافت کر لی یعنی وہ اپنی ہی ذات کی پوجا میں کامل گیان دھیان سے لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت نہیں کیا کہ میرا جی صوفی تھے اور معرفت کے جملہ مراحل طے کر چکے تھے۔ وہ بڑی ایمانداری کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں کہ میرا جی زندگی اور زندگی کے معاملات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نا ٹک ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ انہوں نے خود کو مرکز مان کر کائنات کا بھرپور طریق سے مشاہدہ کیا۔ میرا جی گیانی تو تھے، صوفی بالکل نہیں۔

چوتھا مضمون ''میرا جی کی اہمیت'' ہے۔ زیرِ بحث مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا نے میرا جی کے عہد میں شاعری کے تین مکاتب کا ذکر کیا ہے۔ ایک مکتب اختر شیرانی کا، دوسرا مکتب علامہ اقبال کا اور تیسرا مکتب ترقی پسند نقطۂ نظر کا علم بردار تھا۔ فیض کے ہاں تیسرے مکتب کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ میرا جی ان تینوں مکاتب سے ہٹ کر ایک نئے راستے کا مسافر تھا۔ اختر شیرانی، اقبال اور فیض اپنے اپنے مکاتب کے اعتبار سے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ جبکہ میرا جی اپنے مکتب کا نقطۂ آغاز تھا۔ میرا جی اپنی کسی جہت میں کمال کو پہنچا ہوا نہیں بلکہ امکانات کا ایک جہاں اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اسی لیے آج بھی زندہ ہے اور اپنے اثرات مسلسل پھیلا رہا ہے۔ یہ اثرات ہمہ جہت ہیں یہی مضمون ''میرا جی۔ ایک مطالعہ'' مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی میں بھی شامل ہے۔ تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کریں ''میرا جی۔۔۔ ایک مطالعہ'' کا تجزیہ۔

پانچواں مضمون ''میرا جی'' کے عنوان سے ہے۔ زیرِ مطالعہ مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا اس مفروضے کے تردید کرتے ہیں کہ میرا جی کی موت سست روی کے باعث ہوئی۔ ان کے خیال میں میرا جی کی موت تیز رفتاری کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے قوانین حیات سے بغاوت کی اور یہ بغاوت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھی۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''میرا جی نے محض جسمانی سطح پر سفر کر کے خود کو بار بار مختلف جگہوں ہی سے منقطع نہ کیا، بلکہ زمانے کی مروجہ رسوم اور اخلاقی تقاضوں اور معیاروں کو بھی توڑا۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ اس نے ازدواجی زندگی کے اس ادارے سے بغاوت کی، جس پر معاشرے کی بقا کا سارا دارومدار ہے، پھر اس نے جذباتی بے راہ روی کی وہ روش اختیار کی، جسے سوسائٹی نے ہمیشہ قابلِ اعتراض سمجھا ہے۔ منشیات کی طرف میرا جی کا جھکاؤ بھی انقطاع ہی کی ایک صورت تھی۔ پھر اس نے لباس اور وضع قطع کے ضمن میں بھی سوسائٹی کے مروجہ آداب سے انحراف کیا اور خود کو اجتماع کی بھیڑ چال سے الگ کر کے ایک طرح کی بغاوت کا اعلان کر دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ سماجی سطح پر میرا جی کی یہ بغاوت ایک سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے مطابق تھی۔''(۵۳)

میرا جی سیدھی لکیر کے مسافر نہ تھے۔ ان کا سفر ایک سے زیادہ جہتوں اور سمتوں کا حامل تھا۔ انہیں پیچ وخم مرغوب تھے۔ اگر میرا جی کی نظموں کو تیز رفتار مزاج کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو آسانی سے سمجھ آ سکتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے کہ میرا جی ''ماضی'' کے راستے بستی اور جنگل کی فضا میں اترتے چلے گئے۔ انہیں گوتم کی طرح عرفان حاصل کرنے کی خواہش اور لگن تھی۔ وہ جنگل میں تو پہنچ گئے لیکن پھر مراجعت نہ کر سکے اور گوتم کی طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ شاید ان میں گوتم جتنی روحانی شکتی نہیں تھی۔ ناکامیابی ہی میرا جی کے حق میں بہتر تھی اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو وہ فن کار نہ رہتے بلکہ نجات دہندہ کے منصب پر فائز ہو جاتے اور یہ بات فن کے لیے بلاشبہ مضر ثابت ہوتی۔

میرا جی کی درست تفہیم کے لیے محولہ بالا پانچوں مضامین کا مطالعہ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ میرا جی پر ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ کام خیال انگیز بھی ہے اور فکر افروز بھی۔ یہ معنی و مفہوم کی نئی نئی پرتیں کھولنے کا باعث بھی ہے اور بحث کے نئے در وا کرنے کا سبب بھی۔

''میرا جی شناسی میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ'' طارق حبیب کی ایک عمدہ تحریر ہے۔ مضمون کے شروع میں طارق حبیب نے میرا جی کا ایک مختصر مگر بھرپور اور رواں تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کا تعارف منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ طارق حبیب لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ میرا جی کی سوانح، فکر اور فن پر تنقید کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً سو کے لگ بھگ مضامین میرا جی پر لکھے جا چکے ہیں تاہم مزاج کے اعتبار سے ڈاکٹر وزیر آغا کے مضامین کی حیثیت مختلف بھی ہے اور نمایاں بھی۔۔۔ یہ خالصتاً علمی اور فکری نوع کے مضامین ہیں، اس لیے ان مضامین کی حیثیت تاثراتی ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا کام اس لیے بھی اعتبار کا حامل ہے کہ وہ نہ صرف خود آزاد نظم کے صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں۔ بلکہ ادبیات اردو کے ایک معتبر نقاد کا بھی درجہ رکھتے ہیں۔''(۵۴)

زیرِ نظر مضمون میں طارق حبیب نے ڈاکٹر وزیر آغا کے میرا جی سے متعلق پانچوں مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور ان کی تنقیدی ادب میں قدر و قیمت متعین کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے میرا جی، ن۔م۔ راشد اور مجید امجد کے افکار کو سمجھنے اور سمجھانے کی اولین کوشش کی میرا جی کو سمجھنے کے لیے ان کے مقالات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

میراجی کے حوالے سے ان کی خدمات کو آنے والی نسلیں بھی خراجِ تحسین پیش کرتی رہیں گی۔

یہ مضمون قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ طارق حبیب صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کے میراجی سے متعلق تمام مضامین کا احاطہ کیا ہے اور ان کی میراجی فہمی کے تمام اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔

جدید ادب کے اس شمارے کا دوسرا حصہ ''میراجی کی شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں سات مضامین شامل ہیں۔ ان تمام مضامین کے مطالعے سے میراجی کی ہمہ رنگ اور ہمہ جہت ادبی شخصیت سے آشنائی ہوتی ہے۔

پہلا مضمون جیلانی کامران کا ''میراجی اور نئے لکھنے والے'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں جیلانی کامران مطالبہ کرتے ہیں کہ اردو شاعری میں میراجی کے مقام کا تعین ہونا چاہیے۔ میراجی نے دریافتِ ہندوستان کو اپنا موضوع بنایا تھا اور یہ دریافت ثقافتی سطح پر تھی۔ اس نے جنسی حیات کے مسئلے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جس میں عورت کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میراجی کے نزدیک عورت صرف جنسی عمل اور ممکنات کے ذریعے ایک ایسا وجود اختیار کرتی ہے جو پیدائش کے ساتھ مل کر ایک لازوال صورت میں بدل جاتا ہے اور ناری عورت نہیں رہتی بلکہ ولادت انسان کی علامت بن جاتی ہے۔ جس کی پوجا کے لیے جنسی عمل ہی ایک موثر طریقہ ہے کیونکہ یہ عبادت کسی دوسرے طریقے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔''(۵۵)

ان تمام باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میراجی لذت کو مقصود بالذات قرار دے رہے ہیں۔ میراجی کی شعری قامت تو اس حیرت نامے سے پیدا ہوتی ہے جسے وہ ناری پوجا، نر کی جنسی علیحدگی اور جنسی رشتے کے دائمی عمل سے مرتب کرتا ہے۔ میراجی کا شعری فلسفہ اصل میں نئے ہندوستان کی ولادت کا فلسفہ ہے۔ جیلانی کامران کے خیال میں میراجی کا شعری فلسفہ اور نظموں کا مافی الضمیر تحریکِ آزادی کے پس منظر میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میراجی کا علامتی نقطہ نظر، جنسی رشتہ، ناری پوجا اور نر، ایک ایسا طریق کار ہے جس کی مدد سے میراجی سیاسی تحریکات کے عین پیچھے ایک نئے دور کی ولادت کی نشاندہی کرتا ہے۔۔۔ میراجی ان علامتوں کی مدد سے درحقیقت اس عمل اور سلسلے کو پہچانتا ہے جو انیس سو تیس کے بعد ہندوستان میں ہو رہا تھا۔۔۔ میراجی کا جنسی فلسفہ دراصل ہندوستان کی تاریخ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے ساتھ میراجی کا مقام ہے۔ کیونکہ میراجی کے سوا ایسا کوئی بھی شاعر نہیں ہے جس نے نئے ہندوستان کی رونمائی کا خالص آریائی علامتوں سے ایسا نقشہ تیار کیا جو تاریخی اور شعری طور پر بندے ماترم کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔''(۵۶)

یہاں جیلانی کامران میراجی کا رشتہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو سے جوڑ رہے ہیں۔ ن۔م۔راشد نے بھی انہیں ''ادبی گاندھی'' کا لقب دیا تھا۔ میراجی خود بھی اپنے آریائی ماضی کا ذکر فخر سے کرتے تھے۔ جیلانی کامران نے میراجی کی شاعری میں موجود قدیم ہندوستان کی ثقافتی علامتوں کی سیاسی تعبیر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی رائے ہے کہ:

> ''جیلانی کامران کی رائے اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں میراجی کی شاعری کے سیاسی مفہوم کی نشان دہی کی گئی ہے مگر اس اعتبار سے متنازع ہے کہ میراجی کی شاعری کی سیاسی جہت کو قومیت پرستی کے اس بیانیے کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔ جو تفریقی ہے اور عرفِ عام میں دوقومی نظریہ ہے۔ دو قومیں، دو مذہب، دو زبانیں، قومی شناخت کا بڑا سادہ اصول تھا۔ اصل یہ ہے کہ میراجی کی نظم، سیاسی معنویت تو رکھتی ہے، واضح سیاسی معنی کی حامل نہیں۔۔۔ میراجی کی نظم نہ تو مسلم قوم پرستی کی تائید میں ہے اور نہ ہندو قومیت پرستی کے اثبات میں سرگرم ہے۔ وہ نہ مارکسی جدلیات میں یقین رکھتی ہے نہ قوم پرستی کی جدلیات میں۔ اس کے باوجود ان کی نظم قومیت پرستی کے تناظر میں معنویت کی حامل ہے۔''(۵۷)

جیلانی کامران اقبال اور میراجی میں فرق واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں فرق طرزِ فکر کا ہے۔ میراجی کی شاعری قومیت پرستی کے تناظر میں اپنے اظہار کے امکانات تلاش کرتی ہے۔ اقبال بھی شروع میں قومیت پرستی کے حامی تھے لیکن بعد میں ان کی شاعری کا رُخ اُمتِ مسلمہ کی طرف ہوگیا۔ میراجی کی شاعری اپنے آریائی ماضی کی طرف رُخ رکھتی ہے۔ وہ ماضی کا احیاء نہیں چاہتے۔ ماضی کا تخیل میراجی کی شاعری کا ایک حصہ ضرور ہے پوری شاعری نہیں۔

''ہمارے میراجی صاحب'' ساقی فاروقی کا مضمون ہے۔ ساقی فاروقی اس مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ میراجی نے آدمی کے ان دکھتے ہوئے زخموں اور زنگ خوردہ جنسی جذبوں کی تطہیر کی جنہیں دوسرے شعراء نے دانستہ نظر انداز کر رکھا تھا۔ وہ میراجی کی نظموں کو ''تزکیہ'' کی سطح پر کامیاب بتاتے ہیں۔ وہ عالی حوصلہ بھی تھے۔ ان کی آواز سچی ہے۔ وہ اپنے اندر بڑی شاعری کے امکانات بھی رکھتے تھے۔ وہ علامتوں کے شاعر تھے۔ انہوں نے علامتوں کو پورے سلیقے سے برتا ہے لیکن انہوں نے اپنے بڑے امکانات کو بیان کے الجھاؤ کے باعث مجروح کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میراجی نظم کو خام مواد اور امکانات کا ایک نیا ذخیرہ دے گئے۔ یہ کام بہت اہم سہی لیکن یہی تو سب کچھ نہیں۔ وہ اچھے شاعر نہیں مگر ایک اہم شاعر ہیں۔ بڑے شاعر بھی نہیں، حالانکہ اس کے امکانات ان میں ضرور تھے۔''(۵۸)

ساقی فاروقی نے بڑے جلے کٹے انداز میں میراجی کی تعریف بھی کی ہے لیکن ان کی باتوں سے گمان گزرتا ہے کہ انہوں نے میراجی کی شاعری کو ساری خوبیوں کے باوجود مسترد اور منسوخ کر دیا ہے۔

یہی مضمون ''نظم کا سفر: میراجی'' کے عنوان سے ''میراجی۔ایک مطالعہ'' میں بھی شامل ہے۔ تفصیلی تجزیہ کے لیے ملاحظہ کریں ''میراجی۔۔۔ایک مطالعہ'' کا تجزیہ۔

''میراجی: شخصیت کے ابعاد اور فن کی جہات'' مظفر حنفی کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے میراجی کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے میراجی کی سوانح حیات کا آموختہ کیا ہے۔ وہ میراجی کی ہیئت کذائی بھی بیان کرتے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے وہ میراجی کو نیوراتی اور سادیت پسند بتاتے ہیں۔ وہ میراجی کی ادبی خدمات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ سوچ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اس نرالے فنکار کے تخلیقی سرچشمے کیسے لبالب اور باطنی آگ کتنی تیز ہوگی جس نے بدمستی و خود فراموشی کے عالم میں رہتے ہوئے اتنی قلیل مدت میں اردو ادب کا دامن معیار و مقدار دونوں اعتبار سے وقیع، نو بہ نو تخلیقات سے لبریز کر دیا۔۔۔ میراجی کی تخلیقات میں سب سے زیادہ تعداد نظموں کی ہے جو ۲۲۳ تک پہنچی، انہوں نے تقریباً ۲۲۵ منظوم ترجمے کیے۔ ان کے ۱۳۶ گیت اس پر مستزاد ہیں۔''(۵۹)

مظفر حنفی کے خیال میں میراجی کی بغاوت پسند طبیعت کو غزل کی ہیئتی پابندی راس نہ تھی۔ ان کی غزلیں ان کی ادبی قامت میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔ وہ شمیم حنفی کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتے کہ ''میراجی نے بہت وجد آفرین غزلیں کہیں'' یہاں وہ ایک انکشاف بھی کرتے ہیں کہ میراجی کے متفرق اشعار پڑھتے ہوئے مجھے بے ساختہ آج کے شاعر ظفر اقبال یاد آ گئے۔ زبان کی توڑ پھوڑ اور مضامین کی اکھاڑ پچھاڑ کا جو کام ظفر اقبال اب سرانجام دے رہے ہیں، میراجی نے وہ کام ستر، اسّی سال پہلے کر دیا تھا۔ ظفر اقبال نے میراجی سے کسبِ فیض کیا ہے اس لیے اس کا برملا اعتراف بھی ہونا چاہیے۔

وہ میراجی کی نظموں اور گیتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی نظمیں اپنے عمیق خیالات، وفورِ جذبات اور ہیئت کے انوکھے پن کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ معنیاتی ابعاد رکھتی ہیں۔ ان میں بصری تمثالیں، سمعی پیکر اور سیال امیجری اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ ان کی نظمیں علامتی پیرائے اور ابہام کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہیں۔ انہوں نے نئی علامات، نئی لفظیات، نئی پیکر تراشی، نئے تلازمات اور انسلاکات برت کر اردو شاعری کو ایک جہانِ تازہ عطا کیا۔ ان کے گیت قدیم ہندوستانی روایات، اساطیر، تہذیب، ہندی کا رس، حس، ارضیت کے ساتھ ساتھ متصوفانہ رجحان اور فلسفیانہ تصورات سے بھی مملو ہیں۔ انہوں نے تنقیدی منظر نامے کو وسیع کیا، تجزیاتی مطالعات کی بنیاد ڈالی اور حلقۂ اربابِ ذوق کے روحِ رواں رہے۔ ان تمام خدمات کا اعتراف از حد ضروری ہے۔ میراجی اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

''میراجی جس کا ہنوز انتظار ہے'' عبداللہ جاوید کی تحریر ہے۔ عبداللہ جاوید نے اس مضمون کی مدد سے اس میراجی کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو امکانات سے معمور قلم کار ہے۔ جس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ہنوز ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ان کی نظر میں میراجی ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہے وہ شعر و ادب میں نئے امکانات اور جہات کا متلاشی ہے۔ انہوں نے میراجی کو ان کی غزلوں اور نظموں میں تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہاں انہوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ کاش دہلی ریڈیو والی لڑکی میراجی کو اپنا لیتی تو میراجی زندگی کی شاہراہ پر اور ان کا قلم اوراقِ قرطاس پر نئی توانائیوں کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا۔ وہ میراجی کی ہیئت کذائی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ انہیں نہ ملامتی صوفی تسلیم کرتے ہیں نہ ویشنو متی بلکہ آریائی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں پر تنقیدی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غزلوں میں ان کے عصر کی غزل کا ذائقہ ملے گا اور لفظیات بھی، تراکیب اور فقرہ جات بھی۔۔۔ ان کی غزلیات میں پامال مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ نئے مضامین دینے میں بیشتر غزل گو شعرا سے بہت آگے ہیں۔''(۶۰)

ان کا مؤقف ہے کہ میراجی گیتوں میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔ ان کے گیت دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر فکر اور حسیت چھائی ہوئی ہے۔ دوسرے وہ جن پر ہندو مت او رہندیت کی چھاپ ہے۔ ان کی نظمیں علامتی ہیں۔

وہ اپنی لفظیات کو اپنے ڈھب سے استعمال کرنے کا عادی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک جدید شاعر ہے۔

''میراجی اور معاصر نظم گو شعراء: تقابلی مطالعہ'' مختار ظفر کا مقالہ ہے مختار ظفر اقبال کے بعد اردو نظم کی دو سطحوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلی سطح اقبال کے متاثرین کی اور دوسری سطح داخلیت پسندوں کی ہے۔ دوسری سطح میں دو قسم کی لہریں شامل ہیں۔ پہلی لہر کی نمائندگی میراجی، تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد کی تخلیقی فعالتیں کرتی ہیں۔ جب کہ دوسری لہر میں مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، اختر الایمان، مختار صدیقی، ضیا جالندھری اور منیر نیازی شامل ہیں۔

مختار ظفر میراجی کا تقابل تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد سے کرتے ہیں۔ان کا مؤقف ہے کہ یہ شعراء ہیئت اور جہت دونوں میں مماثلت رکھتے ہیں اور ان کی انفرادیت کا رنگ بھی کافی گہرا ہے۔ان تینوں شعراء نے قدیم شعری اسالیب سے انحراف کیا اور نظریاتی و عملی طور پر معریٰ اور آزاد نظم کو رواج دینے کی کوشش کی۔وہ لکھتے ہیں:

''میراجی، تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد نے اپنے افکار و خیالات کے لیے ایک تو نظمِ آزاد کے ہیئتی Pattern کو ذریعہ بنایا۔دوسرے داخلیت کے اس رجحان کو اپنایا جس سے نظمِ جدید اپنے اصل مزاج سے ہم کنار ہوئی۔''(۶۱)

وہ میراجی کی شاعری کا تقابلی مطالعہ تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد کی شاعری سے درج ذیل حوالوں سے کرتے ہیں:

۱۔ نظمِ آزاد میں ان کی تخلیقی عطا
۲۔ تہذیبی لاشعور
۳۔ شعری روایت اور روایتی اقدارِ حیات سے بغاوت
۴۔ جنسی نفسیات
۵۔ ابہام و اشاریت

ان کے خیال میں خالد کی نظموں میں آہنگ اور اسلوب کا تنوع ملتا ہے۔انہوں نے کم و بیش پندرہ بحریں استعمال کیں۔اس خوبی میں میراجی ان کا ہم پلہ شاعر ہے۔ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے وہ میراجی کا تقابل ن۔م۔راشد سے کرتے ہیں۔راشد قدیم و جدید اسالیب کے ارتباط کا دعویٰ کرتے ہیں راشد کے اسلوب پر اقبال کے اثرات بھی محسوس ہوتے ہیں۔راشد کے ہاں زندگی سے فرار کا رویہ ملتا ہے۔وہ سوسائٹی کی مروجہ اقدار اور روایاتِ زندگی سے، افلاطونی تصورِ محبت سے اور اجنبی حکومت سے بغاوت کرتے ہیں۔جبکہ میراجی نے ہندی شعری روایت سے رشتہ جوڑا اور مغربی شعریات سے استفادہ کر کے ایک غیر معمولی اسلوبِ شاعری وضع کیا۔بغاوت کا رویہ میراجی کی شخصیت اور تخلیقات میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے اس کی بغاوت کئی رنگوں کی مظہر ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میراسین کے تصور میں رہنے کے لیے ثناء اللہ کا اپنی ذات سے بغاوت۔۔۔پھر معاشرتی شخصی روپ سے۔۔۔مروجہ سماجی اخلاقیات اور سوشل مسلمات سے۔۔۔فکری و شعری موضوعات سے۔۔۔اور ہیئت اور اسلوب میں بھی اور یہ بغاوت شعوری ہی نہ تھی۔احساسِ تفاخر کی حامل بھی تھی۔''(۶۲)

مختار ظفر، میراجی کے جنسی عمل اور اس کے شعری اظہار کو شعوری اور جرأت آمیز قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک میراجی نے جلق زنی جیسے مکروہ فعل کو استعاراتی زبان اور حرکی، بصری اور سماعی پیکروں کے ذریعے شعری درجہ دے دیا ہے۔وہ جنسی ملاپ سے پیدا شدہ تصورات اور کیفیات کو محاکات کے ذریعے پیش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔طرزِ زیست، غیر فطری جنسی تلذذ، شعری ابہام اور آزاد نظم کے انفرادی اسلوب نے میراجی کو امتیازی مقام عطا کیا ہے۔علامتوں کے استعمال میں میراجی کو اولیت حاصل ہے۔اس نے پہلی بار ایسی علامتیں پیش کیں جو ملکی کلچر سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔میراجی کا ابہام تخلیقی توانائی اور فنکارانہ حسن کا حامل ہے۔چونکہ میراجی ایک دور بین شاعر تھے اس لیے ان کی علامتیں بھی داخلی اور ذاتی ہیں۔

میراجی کی نظم زوال پذیر سورج کی کہانی ہے۔جس میں تحفظِ ذات کے لیے جبلتِ مرگ سے متصادم ہونا پڑتا ہے۔یہ تصادم میراجی کی نظم کی خاص خوبی ہے۔اس تصادم کی کہانی میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' میں بڑی واضح طور پر سنی جا سکتی ہے۔

فنی لحاظ سے تقابل کرتے ہوئے مختار ظفر کہتے ہیں کہ میراجی کی فنی گرفت کا کمال یہ ہے کہ عروضی غلطیاں دم سادھے بیٹھی رہتی ہیں۔ان کے چھوٹے بڑے مصرعے باہم مربوط ہو کر ایک نامیاتی وحدت تشکیل دیتے ہیں۔وہ ضمیر علی کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں کہ میراجی کے:

''ہر مصرعے کا آہنگ، فضا اور تاثر متنوع بھی ہے اور مجموعی تاثر بھی ایک ہے۔''(۶۳)

مقالے کے آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میراجی کا کمالِ فن ان کی ہیئت اور پیرایۂ اظہار کی تکنیک اور آہنگ میں پوشیدہ ہے۔اس لحاظ سے نہ تصدق حسین خالد ان کی ہمسری کر سکتا ہے۔نہ ن۔م۔راشد یا کوئی دوسرا شاعر۔میراجی فیض اور راشد کے مقابلے میں تاریخی طور پر زیادہ اہم ہے۔اس نے جو اسلوب ایجاد کیا ہے وہ نئی شاعری کا عام رجحان قرار پایا ہے۔

''میراجی کی نظم۔جدید اردو نظم کی نقشِ اوّل'' احمد ہمیش کی مختصر تحریر ہے۔ان کے نزدیک میراجی ایسے جینیس ہیں جنہوں نے تفہیم شاعری کی الگ بنیاد رکھی۔وہ اردو شاعری میں نئی جہت کے بانی ہیں۔میراجی نے لفظ برتنے کا سلیقہ سکھایا انہوں نے اس امر کی بنیادی ڈالی ہے۔کہ شاعری مطالعہ کے لیے ہوتی ہے اور لفظ کے جوہر مطالعہ سے ہی کھلتے ہیں۔

ان کے خیال میں میراجی کی تفہیم میں ان کی نمائندہ نظم ''سمندر کا بُلاوا'' بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔احمد ہمیش نے میراجی کی انفرادیت کو واضح کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔

''کہ گم اس میں ہیں آفاق'' میراجی کی رہائی کا مقدمہ، توحید احمد کا ایک اہم مضمون ہے۔آغازِ مضمون میں وہ اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ میراجی کی ذاتیات میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے والے ناقدین نے میراجی کے لیے عمر قید کی سزا تجویز کی اور اسے کوہ ہندو کش کی برفانی وادیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔یعنی ہم نے میراجی کی درست تفہیم نہیں کی۔

وہ اعجاز حسین بٹالوی کے مضمون ''میرے پیارے لوگو'' جو کہ نومبر ۱۹۹۱ء میں حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے تشخص کی تلاش میں گنگا جمنا تہذیب کی ان روایات کو نا قابلِ قبول سمجھا جن سے متحدہ اسلامی کلچر کا سراغ ملتا تھا۔ میراجی کے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار پر یہ پہلی ضرب تھی۔ میراجی کے ہاں دھرتی پوجا کا رجحان ملتا ہے۔ وہ ہندوستان کی دھرتی اور اس کی زبان کے پجاری تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے معاشرے میں Self consciousness کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس میں میراجی کی قدر نہیں ہو سکتی تھی۔ پاکستان کے نئے سیاسی، سماجی اور ادبی تعصّبات میں میراجی کی مقبولیت کے امکانات کم ہو گئے۔ ہمارا معاشرہ ملائیت اور جدیدیت کی ایک روح فرسا کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس قسم کے معاشرے میں میراجی جیسا اندر جھانکنے والا اور کھل کر بات کرنے والا شاعر مردود ٹھہرا۔ تو حید احمد کو فکر لاحق ہے کہ اعجاز بٹالوی نے یہ تشخیص ۱۹۹۱ء میں کی تھی۔ اب تو حالات پہلے سے زیادہ گمبھیر ہیں۔ اخلاقی اور معاشرتی انحطاط ہمیں پستی کی جانب لے جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں میراجی کو اس کا صحیح مقام و مرتبہ کیسے مل سکتا ہے۔

توحید احمد میراجی کو اردو میں تقابلی ادب کا امام اوّل گردانتے ہیں اور انہیں اعلیٰ درجے کا شاعر، نقاد، نثر نگار اور مترجم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان کا کوئی ڈھنگ کا دیوان دستیاب نہیں صرف ایک کلیات بک رہی ہے جو ۱۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے خریدنا، اٹھانا، کھولنا اور پڑھنا محال ہے۔ وہ حمید نسیم کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ میراجی کے اردو کلام اور برتر نظموں کا جو پچاس سے کم نہ ہوں، بیس سے تیس اعلیٰ گیت اور تین چار غزلوں کا انتخاب حلقۂ اربابِ ذوق شائع کرے تا کہ میراجی کو سمجھنے میں آسانی ہو اور اس کے مقام و مرتبے کا درست تعین ہو سکے۔

مطالعۂ میراجی کے سلسلے میں یہ مضمون خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

اس شمارے کا تیسرا حصہ ''میراجی کی تنقید اور ترجمہ نگاری'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں میراجی کی تنقید اور تراجم سے متعلق پانچ مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین خصوصی توجہ کے حامل ہیں۔ یہ مضامین میراجی کی تخلیقی صلاحیتوں، تنقیدی شعور اور فنِ ترجمہ نگاری پر گہری روشنی ڈالتے ہیں۔

پہلا مضمون ''میراجی کی تنقید'' سید وقار عظیم کا ہے۔ ان کا یہ مضمون کسی حد تک تاثراتی نوعیت کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم عصر شاعروں کی بے شمار نظموں کی ایسی وضاحت میں ہمیں جا بجا نکتہ آفرینی کے موتی چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نکتہ آفرینی میں جو حقیقت میں نکتہ سنجی کا لازمی نتیجہ ہے کہیں کہیں فکر کی گہرائی ہے اور جہاں کہیں یہ ہے بڑی خیال افزاء ہے۔ شاعرانہ تاویلوں کی دلکشی اور دل نشینی ہے اور ان ساری چیزوں کے ساتھ تنقید کے صحیح حق اور منصب کا احساس اور پاسداری بھی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ صرف یہ کہ ہر جگہ نہیں بلکہ بہت کم جگہ ہے۔'' (۶۴)

ان کی تنقید کے بارے میں اپنے مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس میں جا بجا فکر کی بلندی، تخیل کی رنگینی اور بیان کی لطافت کے ایسے جواہر پارے ملتے ہیں کہ پڑھنے والا خواہ ان کی عظمت تسلیم نہ کرے لیکن ان کی محبوبی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔'' (۶۵)

ان کا یہ کہنا کہ ان کی تنقید اپنے اسلوب کے باعث اعلیٰ تنقید کے طور پر مقبول نہ سہی محبوب ضرور ہے۔ ایسی معذرت خواہانہ رائے سے اختلاف ممکن ہے۔ میراجی کی تنقیدی صلاحیت اور ان کے تنقیدی سرمائے کی حیثیت تسلیم کر لینے کے بعد اس سے انکار کیوں کر ممکن ہے۔ وہ میراجی کے دو تنقیدی رویوں کی بات کرتے ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ انہیں ان تنقیدی رویوں کی وضاحت کرنا چاہیے تھی۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں ''میراجی۔۔۔ایک مطالعہ'' اور ''میراجی'' مرتبہ رشید امجد، عابد سیال کا متعلقہ حصہ۔

اگلا مضمون ''میراجی کی تنقید'' ناصر عباس نیر کا ہے۔ انہوں نے اس مضمون کی مدد سے میراجی کی تنقیدی بصیرت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میراجی کی نظم نگاری کی اہمیت کو تو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن جدید نظم کی تنقید کے حوالے سے ان کی خدمات کا جائزہ بہت کم لیا گیا ہے وہ میراجی کی تنقید کو جدید اردو نظم کی اطلاقی تنقید کے اولین نمونے قرار دیتے ہیں۔ وہ انہیں اردو میں مجلسی تنقید کے بانی قرار دیتے ہیں۔ وہ میراجی کی تنقید کا سرچشمہ مغرب کو سمجھتے ہیں تاہم مغربی اثرات کے حوالے سے انہوں نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت عطا کی۔ وہ رقمطراز ہیں:

> ''شارب ردولوی کے نزدیک یہ نئی جہت فرائڈ کے اصول تحلیل نفسی کا باقاعدہ طور پر استعمال ہے۔ مغنی تبسم کے مطابق تحلیل نفسی کے علاوہ مغربی ادب کی تحریکات، علامت نگاری اور ماورائے حقیقت نگاری کو بھی میراجی نے پہلی بار اردو میں متعارف کروایا، جب کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں ''میراجی کی سب سے بڑی خدمت۔۔۔ادب پارے کی بنت میں ثقافتی عوامل کی موجودگی کا احساس دلایا'' گویا میراجی، فرائڈ کی تحلیل نفسی کے بجائے ژنگ کے اجتماعی لاشعور کے نظریے سے متاثر تھے۔۔۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میراجی کی تنقید کی نئی جہت تمام تر نہ تو فرائڈ کی تحلیل نفسی اور نہ ژنگ کے اجتماعی لاشعور سے عبارت ہے۔ میراجی نے مغرب کے نفسیاتی نظریات کو نہیں، مغربی تنقید کے نفسیاتی

طریق کار کو اختیار کیا۔''(۶۶)

ناصر صاحب کے خیال میں میراجی، آئی اے رچرڈز سے متاثر ہیں۔ انہیں نظموں کے تجزیوں کا خیال بھی رچرڈز کے مطالعے ہی سے آیا ہوگا۔ ان کا یہ بھی مؤقف ہے کہ میراجی نے اپنی تنقید کو اپنی شاعری کے دفاع کا وسیلہ یا اس کی شرح کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ان کی تنقید ان کی شاعری اور ان کی معاصر جدید نظم کے متعلق ایک جیسی ہی تھی۔

وہ میراجی کے ہاں دو تنقیدی رویوں کی صورتحال کو واضح کرتے ہوئے میراجی کی رائے کو بیان کرتے ہیں کہ میر، غالب اور اقبال جیسے عظیم شعراء کا مطالعہ کرتے ہوئے ان شعراء کی سوانح سے آشنا ہونا اور ان کی شخصیت کے بارے میں تصور قائم کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ان کا کلام ہی ان کی شخصیت اور انفرادیت کا آئینہ دار ہے جبکہ انشا، داغ اور ایسے دوسرے شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے، ان کے حالاتِ زندگی کو جاننا ازحد ضروری ہے کیونکہ ان کا کلام ان کے ماحول اور ان کے حالات زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر میراجی کی رائے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''غور کریں تو یہاں میراجی نے ایک بار پھر نفسیاتی طریقِ کار استعمال کیا۔ وہ اس طریقِ کار کے عین مطابق اول یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری میں شاعر کی ذات کا انکشاف ہوتا ہے (ذات چھوٹی بھی ہوسکتی ہے اور بڑی بھی) دوم وہ تخلیقی تجربات میں امتیاز کرتے ہیں۔ سوم وہ اسی امتیاز کی بنیاد پر محاکمہ کرتے ہیں۔''(۶۷)

ان کے خیال میں میراجی کی تنقید کا بنیادی مقصد فن پارے میں منکشف ذہنی کیفیت تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے وہ تجزیاتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ جن نظموں میں جنسی کیفیات کا اظہار ہے۔ ان کے تجزیے میں انہوں نے فرائڈ سے مدد لی۔ جہاں کیفیت مختلف ہے وہاں تحلیلِ نفسی سے کام نہیں لیا۔ وہ متن میں منکشف ذہنی کیفیت کے مطابق نفسیاتی بصیرتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

ناصر صاحب میراجی کی تنقید میں کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی تنقید میں اکثر اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی تنقید میں کئی بنیادی تصورات نقد کا ارتقا ممکن نہیں ہوسکا۔ مثلاً وہ تلازم خیال کا محض ذکر کرتے ہیں، وضاحت نہیں۔ تلازمات کی وجہ سے شاعری میں معانی کی کثرت جنم لیتی ہے۔ معانی کی کثرت میراجی کی تنقید کا مدعا نہیں بن سکی۔ ہر تنقیدی طریقِ کار کے امکانات، حدود اور مضمرات ہوتے ہیں۔ میراجی کی تنقید کی کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ نفسیاتی طریق کار کے امکانات، حدود اور مضمرات کو نہیں کھنگالتی۔ ان کی تنقید، اپنے ہی عمل اور جہت سے بڑی حد تک عدم آگاہ ہے۔ میراجی کی تنقید اس سوال کا جواب فراہم کرنے میں بھی ناکام رہی ہے کہ کیا نظم میں مجسم ہونے والی کیفیت ہی واحد اور تمام کیفیت ہوتی ہے یا ایک خام کیفیت پہلے موجود ہوتی ہے۔ جو نظم میں منقلب ہوتی ہے؟ میراجی کا نفسیاتی طریقِ کار متن اور مصنف کی وحدت کا تصور تو رکھتا ہے لیکن یہ وحدت کیسے ممکن ہے؟ اس کا جواب نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ میراجی نظم کے اس مکمل ہیئتی تصور تک نہیں پہنچ سکے جس میں نظم لاشخصی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ نظم کا شخصی تصور انہیں نظم کی تفہیم اور تشریح تک محدود رکھتا ہے۔

بلاشبہ یہ میراجی کی بہت بڑی خدمت ہے کہ انہوں نے نیا تنقیدی طریق کار متعارف کروایا، حلقۂ ارباب ذوق کو شعری تنقید عطا کی، نظم فہمی کی کوششیں کیں لیکن ایک تنقیدی طریق کار کے پیشِ نظر ان کی خدمات بہرحال محدود ہیں۔ میراجی کی تنقید محض ایک پڑاؤ ہے۔ منزل بالکل نہیں۔ شعر فہمی ایک مسلسل سفر ہے! آگے کا سفر!!

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا یہ مضمون میراجی کی تنقید کا ایک کامیاب جائزہ ہے۔ فرائڈ، ژنگ اور میراجی کے حوالے سے انہوں نے جو تحریر کیا ہے۔ اس سے اس مضمون کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

''میراجی بحیثیت نقاد'' ڈاکٹر نذر خلیق کا ایک مختصر لیکن جامع جائزہ ہے۔ سب سے پہلے وہ تنقید اور تخلیق کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے خیال میں میراجی کی تنقید کا تعلق نفسیاتی دبستان سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میراجی عملی تنقید کے نقاد ہیں۔ انہوں نے نظموں کا بے لاگ تجزیہ پیش کیا ہے اور وہ جمالیاتی وفنی اقدار کو بھی تخلیق کا ضروری حصہ سمجھتے ہیں۔۔۔ ان کی کتاب ''مشرق ومغرب کے نغمے'' عملی تنقید کا ایک نمونہ ہے تاہم ''اس نظم میں'' ان کی عملی تنقید کی زیادہ اہم کتاب ہے جس میں میراجی نے اپنے تنقیدی شعور کا بھرپور اظہار کیا ہے۔''(۶۸)

ان کے مطابق میراجی نے تاثراتی تنقید کو نفسیاتی اور جمالیاتی رنگ دیا۔ فرائڈ اور یونگ کے حوالے سے اپنی تنقید کی بنیادیں متعین کیں۔ ان کی تنقید نفسیاتی ہونے کے ساتھ ساتھ تجزیاتی بھی ہے۔ وہ فن کے تمام تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ نظم کو فکر اور فن دو سطحوں پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے تاثراتی تنقید کو سماجی اور شخصی تناظر میں پرکھنے کی سعی کی۔

نذر خلیق صاحب میراجی کی تنقید کو اپنے عہد میں ایک اضافی اور نئی چیز سے تعبیر کرتے ہیں۔

''نگار خانہ: ایک جائزہ'' ڈاکٹر رشید امجد کا ایک تحقیقی اور معلوماتی مضمون ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا شمار اردو ادب کے ان ناقدین میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے ادبی سفر کے دوران خاص طور پر میراجی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور اپنے سنجیدہ مطالعات میں میراجی کی اہمیت اور افادیت کو پیش کیا۔

ڈاکٹر رشید امجد کے نزدیک ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہی قومیں عالمی تناظر میں ایک دوسرے کے جذبات و

احساسات میں شریک ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے علمی، تحقیقی اور ادبی کارناموں سے فیض یاب ہوتی ہیں۔ ترجمہ کا فن اپنے زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا عمل ہے۔ وہ اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ میراجی کے تراجم کی بدولت نظم میں ایک نئی معنوی اور فکری لہر پیدا ہوئی۔ میراجی کے تراجم صرف لفظی نہیں بلکہ انہوں نے مفہوم کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی ہیئت و مزاج کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

''نگارخانہ'' سنسکرت شاعر دامودر گپت کی کتاب ''نٹنی متم'' کا نثری ترجمہ ہے، جو پہلی دفعہ ''خیال'' بمبئی شمارہ جنوری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ کتابی صورت میں نومبر ۱۹۵۰ء میں اسے مکتبہ جدید، لاہور نے شائع کیا۔ دیباچہ سعادت حسن منٹو نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق یہ کتاب نامکمل ہے۔ اس کا بقیہ حصہ غیر مطبوعہ صورت میں اشفاق احمد کے پاس محفوظ ہے۔ یہ کتاب ترجمہ در ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا موضوع ایک زندہ موضوع ہے جو ہر دور میں موجود رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کا مؤقف ہے کہ ''نٹنی متم'' ایک لحاظ سے روسی مصنف الیگزینڈر کیرن کی ''یاما'' سے مماثل ہے۔ دونوں کتابیں اپنے اپنے عہد کی سماجی زندگی کے ایک خاص رخ کی آئینہ دار ہیں۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی اس کی زبان ہے، یہ اردو اور ہندی الفاظ کی آمیزش کا ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خیال کو مکرر تخلیق کیا ہے۔ زبان سادہ و سلیس ہے۔ اسلوب میں ایک بہاؤ ہے جو کتاب کے شروع سے آخر تک موجود ہے۔ میراجی مکالمے کو اس کے نیچرل انداز میں اس طرح ابھارتے ہیں کہ کردار کی نفسیاتی گرہ کشائی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ ترجمہ اپنے مزاج اور موضوع کے لحاظ سے بھرتری ہری کے شتکوں کے تراجم سے بہت سی مماثلت رکھتا ہے۔ یہ ترجمہ اپنی انفرادیت، فکری اساس اور زبان و بیان کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اور افادیت کا حامل ہے۔

''میراجی کا نگارخانہ'' مبشر احمد میر کی ایک تحقیقی اور تنقیدی تحریر ہے۔ سعادت حسن منٹو نے ''نگارخانہ'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے ایک سوال اٹھایا تھا۔ ''نٹنی متم'' کس نے لکھی؟ ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے تحقیقی مقالے ''میراجی شخصیت اور فن'' میں ''نگارخانہ'' سے متعلق لکھا تھا:

> ''یہ ترجمہ بھی انگریزی سے کیا گیا ہے۔ یہ طویل نظم دوسری بہت سی مشرقی کہانیوں کے ساتھ ایک انگریزی انتھالوجی Romances of the east میں شامل تھی۔ (اس پر مرتب کا نام درج نہیں) یہ انتھالوجی ایک زمانے میں (۱۹۴۸ء تک) پنجاب پبلک لائبریری میں موجود تھی۔ میراجی نے اسے وہیں دیکھا اور ترجمے کے لیے منتخب کرلیا۔۔۔ اب نہ Romances of the east کی کوئی جلد دستیاب ہے اور نہ اصل سنسکرت مواد۔'' (۶۹)

مبشر احمد میر لکھتے ہیں کہ کٹنی متم اور اس کی تخلیق کے بارے میں ساہتیہ اکیڈمی کا مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر بہت سے رازوں کو طشت ازبام کرتا ہے۔ اس کے مقالہ نگار ستیش چندر بھٹاچاریہ کے مطابق ''کٹنی متم'' کا مصنف دامودر گپت بہت عرصہ تک گوشہ گمنامی میں رہا۔ اس کا پہلا نسخہ ۱۸۸۳ء میں Peterson نے دریافت کیا۔ ۱۸۸۶ء میں درگا پرشاد نے مزید دو نسخے دریافت کیے۔ ایچ پی شاستری نے ''کٹنی متم'' کا بنگالی رسم الخط میں تحریر شدہ نسخہ نیپال سے تلاش کیا۔ ۱۹۰۳ء میں Johann Jakob Meyer نے Moreset amores indorum کے عنوان سے ''کٹنی متم'' کا جرمن زبان میں ترجمہ شائع کیا۔ کچھ سکالرز نے مل کر ''کٹنی متم'' کا Lessons of a bawd کے عنوان سے انگریزی ترجمہ کیا۔ انہوں نے کچھ اور تراجم کا ذکر بھی کیا ہے لیکن Romances of the east کے نام سے کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ البتہ Google books کے مطابق Edward powys mathers نے Eastern love کے عنوان سے کچھ تراجم کیے اس کی تیسری جلد جو ۱۹۳۰ء میں Horace liveright نے شائع کی۔ اس میں دامودر گپت کے تراجم شامل تھے۔ E.P.Mathers نے یہ ترجمہ غالباً Meyer کی Moreset amores indorum سے کیا ہوگا۔ کیونکہ دونوں تراجم کے شاعر مشترک ہیں۔ لہٰذا ''نگارخانہ'' ترجمہ در ترجمہ کا ترجمہ ہے۔

کٹنی متم کا خالق دامودر گپت کشمیر کے جے پدھ کے دربار سے وابستہ سنسکرت زبان کا شاعر تھا۔

مبشر احمد میر اس ترجمے کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''دامودر گپت نے کٹنی متم میں ہندوستان کے جاگیردارانہ سماج میں پائی جانے والی دھونس دھاندلی اور ہیرا پھیری کے ذریعے ذرائع پیداوار ہتھیانے اور دوسروں کی محنت پر عیش کرنے والے طاقتور طبقات کی لذت پرستی اور خوشامد پسندی کو عیاں کیا۔۔۔ میراجی نے بھی اس کتاب کی انہی خوبیوں کی بنا پر اس کا ترجمہ شروع کیا جو بوجوہ مکمل نہ ہو سکا۔'' (۷۰)

مبشر احمد میر کے مطابق میراجی ترجمہ کرتے ہوئے متن کو کچھ اس طرح اپنا بنا لیتے ہیں کہ اجنبیت اور غیریت کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ ان کے تراجم کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ خامی اس لیے کہ ہم اس ترجمہ سے مغربی شاعری کی روایت اور اس میں استعمال ہونے والے استعاروں سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ اگر ترجمے کا مقصد کسی معاشرے کو سمجھنا ہے تو اس معاملے میں میراجی کے تراجم بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ البتہ ان کے تراجم میں استعمال ہونے والی زبان ان کے سماجی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے تراجم کی مدد سے مشرق اور مغرب کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان تراجم کی مدد سے انہوں نے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے مذہبی اور لسانی تعصبات کے خلاف اپنے انداز میں جہاد کیا ہے۔ انہوں نے ایسا اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ہندی اور اردو کو ایک دوسرے کے قریب لائے۔

یہ ایک اہم معلومات افزا مضمون ہے۔

جدید ادب کا چوتھا حصہ ''میرا جی: نئے لکھنے والوں کی نظر میں'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں ۱۲ نئے لکھاریوں کے ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ اس حصے میں میرا جی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرے اور تجزیے ہیں۔ تفہیم میرا جی کے ضمن میں ان مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان جدید ناقدین نے اپنے مضامین کی وساطت سے میرا جی کو معاصر تنقید کے نئے نئے رجحانات کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اس ضمن میں پہلا مضمون ''ابہام کی جمالیات: میرا جی'' معید رشیدی کا مضمون ہے۔ معید رشیدی نے میرا جی کی نظموں میں موجود ابہام کی صورتحال کو نئے تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ اپنے انداز کا ایک منفرد مضمون ہے۔ ان کی نظر میں میرا جی کی شخصیت اور شاعری دونوں کا ابہام سے گہرا رشتہ ہے وہ مضمون کے شروع میں میرا جی کے دو اشعار پیش کرتے ہیں:

جانے کس پاتال سے آئے

دھندلی رات کے دکھیا سائے (۷۱)

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا (۷۲)

یہاں آوارگی ابہام کا چہرہ ہے۔ دھندلی رات کے دکھیا سائے نے ابہام کی رِدا اوڑھ لی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ابہام شعری خواص کو توانا بناتا ہے۔ کیونکہ یہ شاعری کی جڑوں میں پیوست ہے۔۔۔ کوئی بھی نظم، چاہے اس کا بیانیہ جتنا بھی مطالعہ شرح، تعبیر یا تجزیے کے لیے نہ صرف ابہام کے درجات سے ہو کر گزرتا ہے، بلکہ ان میں الجھتا بھی ہے۔۔۔ میرا جی کی شاعری میں ابہام ایک پاتال ہے۔ فکری بنت، دھندلی رات کی مانند ہے اور دکھیا سایہ ان کا مرکزی شعری کردار۔ اسی لیے ابہام کی جمالیات کو ہم نے ان کی شاعری کا سرنامہ بنایا ہے۔'' (۷۳)

ابہام کی جمالیات نے میرا جی کے تخیل کو دبازت عطا کی ہے۔ ابہام میں ابلاغ کا عمل جمالیات کو بھی طے کرتا ہے۔ ابہام نہ تو اہمال ہے اور نہ اشکال۔ اہمال تو مہمل گوئی کو کہتے ہیں جبکہ ابہام تو معنی خیزی کا عمل ہے یہاں کوئی نہ کوئی معنی ضرور نکلتا ہے۔ معید رشیدی نے بڑی کھری بات کہی ہے کہ جب کوئی بھی بشیر بدر اور احمد فراز کو پڑھنے کا عادی ہو جاتا ہے تو میرا جی اور ن۔م۔ راشد کی شاعری اُسے مہمل تو ضرور لگے گی۔ کچھ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ فیض ہماری زبان پر رہتے ہیں، میرا جی نہیں رہتے۔ ان کا کلام زبان زد نہیں ہوتا۔ بھئی زبان زد تو چٹکلے بھی ہو جاتے ہیں۔ میرا جی تو وجود کا شاعر ہے۔ وہ مٹی میں چھپے پاتال میں لے جانا چاہتا ہے۔ جب زندگی ہی مبہم ہے تو پھر میرا جی سے کیوں مطالبہ کیا جائے کہ ان کی شاعری کے مطالب آسان ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم ایمپسن نے ابہام کی سات اقسام بتائی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ابہام تو بت ہزار شیوہ ہے۔ اس تک رسائی کے سات نہیں ہزاروں در ہیں۔ اس کی تہہ میں اترنے کی کوشش میں مزید الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شمس الرحمٰن فاروقی کے درج ذیل تین مضامین کا تعلق براہِ راست ابہام سے ہے۔

۱۔ تعبیر کی شرح ۲۔ ترسیل کی ناکامی کا المیہ ۳۔ شعر کا ابلاغ

معید رشیدی صاحب میرا جی کی نظم ''چل چلاؤ'' میں ڈرتا ہوں مسرت سے اور ''سمندر کا بلاوا'' میں ابہام کو ایک نئے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ ''دن کے روپ میں رات کہانی''، ''جاتری''، ''محبت''، ''اونچا مکان''، ''عکس کی حرکت''، ''شام کو، راستے پر''، ''اُفتاد''، ''محبوبہ کا سایہ'' اور ''فنا'' جیسی تمام نظموں میں ابہام کی جمالیات، قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

''میرا جی: ایک نظر میں'' سہیل اختر کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے میرا جی کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے پہلے دہے کے آخری سال اور دوسرے دہے کے پہلے دو سالوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۱۰ء میں ن۔م۔ راشد، ۱۹۱۱ء میں فیض احمد فیض اور ۱۹۱۲ء میں میرا جی کی پیدائش ہوئی۔ جب ان تینوں نے اردو ادب کے منظر نامے پر قدم رکھا تو ہندوستان سیاسی اور معاشی کش مکش کی لپیٹ میں تھا۔ تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ مغرب میں جدیدیت کی تحریک نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ ان تینوں نے اپنے اپنے منفرد، مختلف اور باشعور ردِعمل سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔

سہیل اختر اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ علامہ اقبال اپنی تمام تر عظمت کے باوجود افکار و خیالات اور اسلوب و نظریۂ فن دونوں سطحوں پر نئی نسل کے تخلیق کاروں کے لیے مشعلِ راہ نہ بن سکا۔ فیض، راشد اور میرا جی نے نئی نظم کے لیے الگ سنگِ بنیاد رکھا۔ فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے سماجی مسائل اور ان کے حل کو بیان کرنے کے لیے غزل کو چنا اور کچھ نظمیں بھی کہیں۔

ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم کی ہیئت کو اپنایا اور اسے وسعت دی۔ انہوں نے فارسی آمیز اردو زبان کو برتا۔ میرا جی نے اپنے لیے سب سے مشکل راہ کا انتخاب کیا۔ انہوں نے فارسی آمیز اردو کی بجائے ہندی آمیز اُردو زبان کی بازیافت کی۔ انہوں نے اپنی نظموں کی فضا سازی کے لیے ہندو دیو مالا اور اساطیر سے مدد لی۔ انہوں نے مظاہرِ فطرت میں ڈوب کر انہیں اپنی نظموں کا پس منظر بنایا۔ دھرتی سے لگاؤ کا جو والہانہ پن ان کے یہاں موجود ہے۔ ان کے معاصرین کے ہاں مفقود ہے انہوں نے اردو نظم نگاری میں ایک ایسی راہ ہموار کی جس پر آنے والی نسلیں اپنا

تخلیقی سفر طے کر رہی ہیں۔ اپنے دور کی مختلف جہتوں، تہہ در تہہ مسائل کی پیچیدگیوں کو جس طرح میرا جی نے اپنی نظموں کا حصہ بنایا، وہ انہی کا حصہ ہے۔

ان کے خیال میں میرا جی کے ساتھ ہونے والی ان گنت زیادتیوں میں سے ایک زیادتی یہ ہے کہ ان کی نظموں کے بیشتر حصے کو جنسی بیمار ذہنیت کی اُپج بتایا گیا۔ حالانکہ میرا جی کی نظموں کا منظر نامہ بے حد وسیع ہے۔ جنس کا پہلوان کی نظموں میں زندگی کے مختلف رنگوں اور جذبوں کی طرح ہی آیا ہے۔ ان کے گیتوں اور غزلوں میں بھی ان کا وہی اسلوب اور لفظیات دیکھنے کو ملتی ہے جو ان کی نظموں میں ہے۔

سہیل اختر میرا جی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''میرا جی جدید نظم کا وہ باب ہیں جسے پڑھے بغیر نیا لکھنے والا اپنے شعری سفر پر زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ میرا جی آج بھی لکھنے والوں کے تخلیقی و ذہنی سفر میں ہم سفر ہیں۔ انہوں نے تقریباً تن تنہا نئی نظم کو جو ہمہ گیری اور وسعت عطا کی اس کے لیے اردو نظم نگاری ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔''(۷۴)

اس مضمون کی مدد سے میرا جی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

''میرا جی کی نظموں کی چیستانی صورتِ حال'' قاسم یعقوب کی تحریر ہے۔ اس مضمون میں میرا جی کی نظموں سے متعلق درج ذیل سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ میرا جی کی نظموں کے موضوعات کیا ہیں؟

۲۔ موضوعات کی فکری اور فنی دروبست کا مقام کیا ہے؟

۳۔ میرا جی کا کردار اور ان کی نظموں میں ان کا کردار۔۔۔ کیا یہ دونوں کردار میرا جی کی شخصیت کا حصہ تھے؟

۴۔ کیا میرا جی کی کرداری چیستانی صورتِ حال ان کی نظموں کی بھی صورتِ حال بنی؟ کیا میرا جی کی نظموں کے مبہم لسانی پیکر ان کی شخصیت کا پرتو تھے؟

۵۔ میرا جی کا ابہام فنی ابہام ہے یا نفسیاتی؟

۶۔ فنی چیستانی صورتحال کا معمہ کیا چیز ہے؟

قاسم یعقوب کے خیال میں میرا جی کی نظمیں تین اقسام کے متون میں بٹی ہوئی ہیں۔ پہلی قسم نظموں کا اپنا وجود، دوسری قسم ثناءاللہ ڈار کے کردار والی، تیسری قسم میرا جی کے بے ترتیب کردار والی۔ میرا جی کی نظموں کی فکری اُپج دو قسم کے موضوعات سے عبارت ہے۔ پہلا موضوع فرد اور سماج کا رشتہ اور دوسرا موضوع ذات کی نفسیاتی الجھنوں کا اظہار ہے۔ فرد اور سماج کے رشتے سے منسلک ان کی صرف دو چار نظمیں ہی ہیں۔ وہ تمام عمر ذات کی کج رویوں کے فلسفۂ تشریح و ابلاغ میں الجھے رہے۔

اس مضمون کا ''آغازیہ'' میرا جی کے متن کی فکری تشکیل کرتا نظر آتا ہے۔ میرا جی جتنا نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے اتنا ہی ہیجانی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا ''شعوری'' ادراک بھی رکھتے تھے۔ ان کی نظموں کا متن فنی مطالعے کا تقاضا زیادہ اور نفسیاتی مطالعے کا تقاضا کم کرتا ہے۔

ان کا مؤقف ہے کہ میرا جی کی نظموں میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا ابہام ہے۔ ابہام دو طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ متن کی معنیاتی حدود کے سکڑاؤ سے۔

۲۔ متن میں موجود معنیاتی ابعاد کے پھیلنے کی وجہ سے۔

میرا جی کا ابہام متن کی معنیاتی حدود کے سکڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کا ابہام ذات کی لاشعوری یا شعوری اُلجھنوں کا، فنی سطح پر، درست اظہار نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ میرا جی کی کئی نظمیں با قاعدہ چیستانی عکس بندی ہے۔ مثال کے طور پر چیستاں، پردان دان کی پہیلی، الجھن کی کہانی، ایک ہی کہانی، دو نقشے، یہودی اور چنچل بیٹی شیطان کی وغیرہ۔ یہ نظمیں میرا جی کے فنی لاشعور میں موجود گیتوں کا بھی پتا دیتی ہیں اور ان کے ذہن میں موجود چیستانی صورتِ حال کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے تو ایسا لگا ہے کہ وہ اپنے شعری سفر میں گیت سے آگے بڑھے ہی نہیں۔ فنی سطح پر بھی اور ان کا خود شعور بھی۔۔۔ وہ جہاں گیت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا فن شدید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے اور ابہام کے معنیاتی سکڑاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔۔۔ میرا جی کے تراجم ''نگار خانہ''، ''مشرق و مغرب کے نغمے''، ''خیمے کے آس پاس'' میں بھی میرا جی کی ترجمہ نگاری گیت کی فضا سے باہر نہ آ سکی۔''(۷۵)

قاسم یعقوب مضمون کے آخر میں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ''میرا جی کی نظمیں''، ''پابند نظمیں'' اور ''تین رنگ'' میرا جی کے تین شعری مجموعے ہیں۔ انہیں اپنے تخلیقی معیارات میں تین موڑ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں میرا جی کا شعری سفر بتدریج نکھرتا ہوا ملتا ہے۔

''جنسی آسودگی کا خواہشمند شاعر: میرا جی'' مستبشرہ ادیب کا گمراہ کن عنوان کے ساتھ ایک سلجھا ہوا مضمون ہے۔ یہ میرا جی کے جنسی موضوع پر ایک مدلل اور کامیاب تحریر ہے۔ اس

مضمون میں جنس کے پہلو یعنی وصال کی خواہش کے متعلق چند نظموں کے بارے میں تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ میراجی کی قائم کردہ روایت نے کس طرح اردو شاعری میں سلسلہ روایت کی شکل اختیار کی ہے، کا جائزہ تقسیم ہند کی بعد کی شاعرات ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور فہمیدہ ریاض کے کلام کے ذریعے سے لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے مطابق میراجی نے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پاسدار شعری روایت سے انحراف کیا اور تخلیقی طریقِ کار میں موضوعات کی سطح سے لے کر طرزِ اظہار اور ہیئتی نظام میں بہت کچھ نیا کر دکھانے کی سعی کی۔میراجی کی مدد سے اردو شاعری پہلی دفعہ انسان کی فطری جنسی دنیا سے روشناس ہوئی۔ان کا ابتدائی کلام انسان کی فحش قرار دی گئی قدرتی اور فطری کیفیات کو تہذیب کے پردوں سے باہر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔انہوں نے نظم کو جنس کے انوکھے اور غیر مانوس تجربے کے ذائقے سے آشنا کیا۔

میراجی کا تصورِ جنس تہذیب وتمدن کی کھوکھلی، عارضی اور غیر ضروری روایات کے خلاف لیکن فطرت کے عین مطابق ہے۔انہوں نے جنس کے علاوہ انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی مشاہدے کے آئینے سے دیکھا اور دکھایا ہے اور انہیں تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے۔میراجی کی نظموں کا عمیق مطالعہ کریں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ میراجی کی تخلیقی ہنرمندی، اس کے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں حقیقی اور فطری جذبات وکیفیات کو یکجا کر کے منظم شکل دینے کی صلاحیت ان کی نظموں کو نمایاں مقام دلواتی ہے۔جنسی آسودگی کا خواہش مند شاعر کہیں بے قابو نہیں ہوتا۔اس کے اظہار میں نہ کہیں جھنجھلاہٹ ہے۔نہ منت سماجت، بلکہ فاصلہ کا شدید احساس ہے۔وہ عورت کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مستبشرہ ادیب رقمطراز ہیں:

> ''تقسیمِ ہند کے بعد کی شاعرات کے یہاں بھی جنس کے مختلف پہلوؤں کو نظم کرنے کی روایت عام ہے۔یعنی شاعرات نے میراجی کی قائم کردہ روایت کو آگے ہی نہیں بڑھایا بلکہ حجاب کے پردوں سے باہر لا کر عورت کو اس کے فطری تقاضوں کے ساتھ شاعری میں پیش کیا ہے۔۔۔ان میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی کے علاوہ فہمیدہ ریاض کا نام سرِ فہرست ہے۔'' (۷۶)

وہ جنسی خواہش اور جنسی عمل کو بقائے انسان کا ضامن قرار دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں جنس کو گندہ سمجھ کر چاہے تہذیب کے جتنے موٹے غلاف مرضی چڑھا دیے جائیں، یہ سچا جذبہ ہے۔اس فطری حقیقت سے کوئی بھی فنکار، ادیب یا تخلیق کار بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔

''میراجی بعض ادیبوں کی نظر میں'' ڈاکٹر سید محمد یحییٰ صبا کی تحریر ہے۔یہ ایک طویل مضمون ہے لیکن مذکورہ شمارے میں اس مضمون کے صرف ۱۱۶قتباسات شامل کیے گئے ہیں۔یہ اقتباسات میراجی کا ایک رواں اور بھرپور تعارف پیش کرتے ہیں۔پہلا اقتباس قومی مجلس برائے تعلیمی تحقیق، نئی دہلی سے شائع شدہ مضمون کا ایک حصہ ہے۔اس میں میراجی سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔دوسرا اقتباس جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل) میراجی سے متعلق شائع ہونے والی اہم معلومات پر مبنی ہے۔تیسرا اقتباس پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی کے ایک مضمون ''اردو نظم کا آغاز وارتقا'' کا ایک حصہ ہے۔ان کے خیال میں میراجی نے اردو نظم کو ہیئت اور طرز دونوں اعتبار سے یورپی نظموں کے بلند معیار سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی۔چوتھا اقتباس حیدر قریشی کے مضمون کا ابتدائی حصہ ہے۔یہ مضمون انہوں نے ڈاکٹر رشید امجد کے پی ایچ ڈی کے مقالے میراجی شخصیت اور فن کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا ہے۔پانچواں اقتباس ڈاکٹر انور سدید کے مضمون کا ایک حصہ ہے۔چھٹا اقتباس کمار پاشی کے مضمون ''ہندوستان کی تہذیبی اقدار کا محافظ میراجی'' سے لیا گیا ہے۔

ساتواں اقتباس ن۔م۔راشد کی تحریر ہے۔نواں اقتباس ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک مضمون میں سے لیا گیا ہے۔اخلاق احمد دہلوی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، احمد بشیر، اعجاز احمد اور محمود ہاشمی کے مضامین کے ایک ایک اقتباس کو اس مضمون کی زینت بنایا گیا ہے۔ڈاکٹر سید محمد یحییٰ صبا نے اپنی رائے کا کہیں بھی اظہار نہیں کیا۔بہر حال ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔

''میراجی کی نظمیں اپنے عہد کے تناظر میں'' احتشام علی کا ایک مختصر لیکن جامع مضمون ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ حلقہ اربابِ ذوق کے تحت جدید اردو نظم کی روایت کے فروغ میں میراجی کو ایک بنیاد ساز کی حیثیت حاصل ہے۔انہوں نے مغرب کی شاعری کے جدید رجحانات سے ہمیں متعارف کروایا۔وہ مشرقی ومغربی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔کوئی انہیں ملارمے اور بودلیئر کا پیروکار سمجھتا ہے اور کوئی انہیں کبیر، میرابائی، چنڈی داس، امرو اور ودیاپتی سے اکتسابِ فیض کرتا دکھاتا ہے۔اگر میراجی کی نظموں کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ میراجی کی نظموں کے بہت سے میلانات میراجی کو اپنی ذات میں چھپی محرومیوں، نفسیاتی الجھنوں اور جنسی ناآسودگی کی دین ہیں۔ان کی شاعری میں موجود علامتیں فرد کے نفسیاتی مسائل، جنسی اُلجھاوؤں، اذیت پرستی اور لایعنیت ایسے رجحانات کی عکاس ہیں۔ان کی نظموں کا بالواسطہ طرزِ اظہار، نت نئی تمثالوں اور علامتوں کا استعمال نظموں کو اکہریت اور سپاٹ پن سے بچاتا ہے۔

احتشام علی کا مؤقف ہے کہ مغربی شعرا سے آشنائی اور جدید مغربی رجحانات کا مطالعہ میراجی کی شعری کرافٹ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ہم میراجی کی شاعری کو مبہم قرار دے کر اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں وہ اسے میراجی اور جدید اردو نظم دونوں کے ساتھ ظلم قرار دیتے ہیں وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ میراجی کی نظموں کے متن میں موجود نیم روشنی اور کثیرالمعنویت کو تنقید کے جدید رجحانات کی روشنی میں ڈی کوڈ کرنا چاہیے تاکہ میراجی کی معنویت آشکار ہو سکے۔

''میراجی کی غزل'' ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کا ایک اہم مضمون ہے۔وہ میراجی کی غزل کو روایت سے جڑا ہوا اور روایت سے منحرف بھی خیال کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میراجی نے غزل کی طرف زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ میراجی کی انفرادیت پسند طبیعت اور باغیانہ مزاج کے لیے نظم کی صنف زیادہ موزوں تھی۔غزل اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔اس کے علاوہ غزل جس تہذیب کو پیش کر رہی تھی وہ ہند اسلامی تہذیب تھی جبکہ میراجی کی روح ہند آریائی تہذیب کے منطقوں میں محوِ پرواز تھی۔

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، میراجی کو جدیدیت کا علمبردار گردانتے ہیں جدیدیت، روایت سے مکمل انقطاع کا مطالبہ کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ میراجی کھل کر غزل نہیں کہہ سکے۔لہٰذا

میراجی نے جو غزلیں کہی ہیں وہ روایت سے مکمل انقطاع نہ کر سکنے کا نتیجہ ہی ہیں۔ میراجی کی غزل کا بیانیہ سادہ اور قابلِ فہم ہے۔ ابہام ان کی غزل میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ان کی غزل میں ہندی الفاظ کی آمیزش غزل کے لیے ایک نئے لسانی پیرائے کی تشکیل کی کوشش کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میراجی جس نئے لسانی پیرائے کی تشکیل میں مصروف تھے اس کا مدعا انفرادی تجربے اور اسلوب میں مطابقت پیدا کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے اردو غزل کی زبان میں نئی لفظیات کو شامل کیا۔ ان کا انفرادی تجربہ اور رویہ گرد و پیش کی دنیا کو نئے انداز میں تخلیق کرنے پر اُکساتا تھا۔ مروّج اور مستعمل الفاظ حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اردو غزل کو بھی نئے اسالیب سے روشناس کرانے کی ٹھانی۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ حقیقت کو مکروہ شکل میں دریافت کرتے ہیں اور بدصورتی میں سچائی کا نشان پاتے ہیں۔ ان کا یہ پُراسرار تجربہ غزل کے محدود فریم ورک کے اندر ایک نئے لسانی پیرائے میں منکشف ہوتا ہے۔''(۷۷)

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی صاحب نے اس مضمون کی مدد سے میراجی کی لسانی تشکیل کے ابتدائی نقوش کو اجاگر کیا ہے۔ زبان کی توڑ پھوڑ اور مضامین کی اکھاڑ پچھاڑ کا جو کام ظفر اقبال کی ''گلافتاب'' کی صورت میں ۱۹۶۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کا آغاز میراجی نے بہت پہلے کر دیا تھا۔ میراجی کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ ان کے لسانی تجربے نے اردو غزل میں کسی پیچیدگی یا مغائرت کو جنم نہیں دیا بلکہ یہ لسانی تجربہ ان کے تخلیقی تجربے سے ہم آہنگ ہو کر ابھرا ہے۔

''میراجی کے گیت'' ایک تعارف، ایک جائزہ، شکیل کوکب کی تحریر ہے۔

اس میں انہوں نے میراجی کی پہلی شعری تصنیف ''میراجی کے گیت'' کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ ''میراجی کے گیت'' ۱۹۴۳ء میں مکتبہ اردو، لاہور سے شائع ہوئی یہ تصنیف ۵۰ گیتوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک پیش لفظ اور ایک دیباچہ ''گیت کیسے بنتے ہیں'' کے عنوان سے شامل ہے۔ پیش لفظ اور دیباچہ میراجی نے خود تحریر کیے ہیں۔

شکیل کوکب سب سے پہلے گیت کی تعریف، مزاج اور ہیئت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ میراجی کے گیتوں میں ہندی فضا پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ان میں موسیقیت اور غنائیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جنس میراجی کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ وہ ہجر و فراق کی کیفیات کی بھی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ کچھ گیت مذہبی نوعیت کے بھی ہیں۔ وہ اس تصنیف میں شامل گیتوں کو گیت نگاری کے فن پر میراجی کی دسترس کا منہ بولتا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ یہاں کسی قسم کا کوئی ابہام موجود نہیں البتہ میراجی گیت نگاری کی روایتی کسک کی پابندی کرتے نظر آتے ہیں۔

''میں ڈرتا ہوں مسرت سے'' میراجی کی ایک نظم کا مطالعہ شہناز خانم عابدی نے پیش کیا ہے۔

ان کے خیال میں نظم کا عنوان ''میں ڈرتا ہوں مسرت سے'' انوکھا اور چونکا دینے والا ہی نہیں بلکہ فکر انگیز بھی ہے۔ اس نظم میں کسی مریضانہ خوف کو موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا۔ یہ نظم تو لفظ، لفظ، فقرہ، فقرہ اپنے اسرار کھولتی ہے۔ نظم آگے بڑھنے کے ساتھ پرت پرت کھلتی بھی ہے اور خشت خشت تعمیر بھی ہوتی ہے۔ نظم کا یہ سفر فکری، معنوی اور حسیاتی نوعیت کا ہے میراجی کی تخلیقی توانائی تجریدی فکر کو تجسیمی فکر میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

شہناز خانم عابدی نظم کے عنوان کو ایک ''مرکب استعارہ'' سے تعبیر کرتی ہیں کیونکہ اس نظم کا لفظیات کی ایک سے زائد سطحوں پر ابلاغ ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''میراجی اپنی اس نظم میں ایک جانب خوف زدہ ہیں تو دوسری جانب وہ حزن سے چھٹکارا پانے کے حق میں نہیں ہیں۔ یہاں میں میراجی کی نظم کے دیوتاؤں کو اولیاء اللہ سے مبدل کرنے کی جسارت کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ اہلِ نظر میں کسی کو گراں گزرے تو معذرت۔''(۷۸)

ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا پورا حق ہے۔ معذرت کیسی جو کچھ محسوس کیا جائے اسے من و عن بیان کر دینا چاہیے۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے۔ یہی تو تنقید ہے۔

میراجی کے ہاں حزن ہی نہیں حزن پرستی بھی ملتی ہے۔ اسی وجہ سے میراجی کی فکر اولیاء اللہ سے لگا نہیں کھاتی۔ میراجی تو اولیاء اللہ اور دیوتا کی بجائے ''آدمی'' کو اہمیت دیتے ہیں۔ میراجی کا رجحان ویشنومت کی فکر سے مربوط ہے۔ جس میں حقیقی مسرت سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں۔ وصال ناممکن الحصول ہے۔ فراق انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔

''میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' اور اس کے رنگ'' سید اختر علی کی تحریر ہے۔ سیّد اختر علی، میراجی کو علامت اور آواز کا شاعر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میراجی کو:

''جہاں علامات اور استعارے کے پنکھ لگا کر معنی مضمون کی اونچی اڑان بھرنے میں مزہ آتا ہے تو وہیں دوسری طرف پھیکے اور گہرے یا شوخ و چنچل رنگوں سے بنے کیفیات کے پرچم لہرا کر الفاظ کے ذریعہ جذبات اور احساسات کے طبل پر تھاپ مار کر کائنات کی لونی صوتی دنیا میں ہلچل پیدا کرنے میں لطف آتا ہے۔''(۷۹)

سید اختر علی صاحب نے بڑے منفرد انداز میں میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ ہمیں بڑی تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ اس نظم میں میراجی نے کن کن الفاظ میں تصور کے کون کون سے رنگ بھرے ہیں اور لوازم کے کون سے ہالے اس میں بُنے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظم کا لب و لہجہ دھیما اور مزاج ٹھہراؤ والا ہے۔ یہ نظم داخلی جذبات و احساسات اور شاعر کے وسعتِ مطالعہ کا عجیب و غریب ماورائی سنگم ہے۔ یہ نظم ایک وجدانی کیفیت میں لکھی گئی ہے۔ اس اکیس سطری نظم میں تقریباً چوبیس رنگ ہیں ان سب رنگوں پر محیط سمندر کا رنگ ہے۔

''سمندر کو اوپر سے دیکھیں تو نقطہ لگے، سامنے سے دیکھیں تو خط اور اس کی پہنائیوں میں پہنچ جائیں تو سطح۔ نقطہ ابتدائے وجود ہے۔ اس وجودی نقطہ سے خط بنا اور اس خط سے سطح وجود میں آئی اور ان تینوں کے اشتراک سے کائنات کے اجسام کی تجسیم ہوئی۔ سو سمندر تینوں رنگوں پر محیط تجسیمِ کائنات کا رنگ ہے۔''(۸۰)

میراجی کی نظموں کا منظر نامہ بھی سمندر اور اس کائنات کی طرح وسیع اور گہرا ہے۔ انہوں نے اپنے تصوّر وخیال کے ایک ایک دھاگے کو مختلف رنگوں سے رنگا ہے اور پھر فکر وفن کی چادر کو ان مختلف رنگ کے دھاگوں سے مزین کیا ہے۔ اس طرح ایک دل پذیر تصویر آنکھوں کے سامنے اپنی چھب دکھاتی ہے۔ یہی میراجی کا کمالِ فن ہے۔

''اجنتا۔ اورنگ آباد اور میراجی'' کے عنوان کے تحت ہاجرہ بانو نے میراجی کی نظم ''اجنتا کے غار'' کا ایک بہترین تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ وہ میراجی کی نظموں کو اُن کا ذاتی تجربہ قرار دیتی ہیں۔ وہ میراجی کی شاعری کو کسی درد کا وہ مرہم خیال کرتی ہیں جو آہستہ آہستہ زخم کو مندمل کر کے راحتِ جاں کا سبب بنتی ہے نہ کہ طلسماتی اثر دکھا کر پل بھر میں غائب ہو کر پھر سے درد کی توانائی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ یہاں نفس مضمون اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ان کے خیال میں میراجی فرائڈ سے بھی متاثر ہیں اور ای ای کمنگس سے بھی۔ وہ لکھتی ہیں:

''فرائڈ کے ذہنی نظریئے کے زیرِ اثر میراجی کی شاعری نے حقیقی جنس کو اولیت بخش کر شعور کی سطح کو نہ چھوتے ہوئے لاشعور اور انتشاریت کی بوقلمونی کائنات میں گھر بسانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔۔۔ میراجی کا ہر شعر اپنے اندر موسیقی کے تمام سروں کی شناخت رکھ کر لے اور آہنگ کو اس سلیقے کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ بنجر روح کوکھ میں تازگی کی کونپلیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ کہیں کہیں ای ای کمنگس کی طرح لاشعوریت کے مسطح میدان میں ضرور پہنچاتی ہیں۔''(۸۱)

مختلف علامات اور اشارات میراجی کے جنسی تصور کو انوکھے اور منفرد انداز میں پیش کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ میراجی، اس نظم کے ذریعے گزشتہ صدیوں کا سفر پل بھر میں جذبات اور لاشعور کی آنکھوں کے ذریعے طے کراتے ہیں۔ میراجی نے ''اجنتا کے غار'' میں بند پوری تاریخ کو مصور ہی نہیں کیا متحرک بھی کیا ہے۔ یہی میراجی کا اوجِ کمالِ فن ہے۔

''خراجِ عقیدت بخدمت میراجی'' کے عنوان سے ہاجرہ بانو نے میراجی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ میراجی کے مختصر حالاتِ زندگی، ادبی خدمات اور میراجی کی ہیئت کذائی بیان کرنے کے بعد ان کی شاعرانہ اور تنقیدانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میراجی نے جنسی جذبات کو موضوع بنا کر اسے زندگی کی ایک زندہ علامت اور فعال قوت کے طور پر چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت اور فنی بصیرت انہیں امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔

''ترقی پسند نظم نمبر اور میراجی'' کے تحت حیدر قریشی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی (ایک ترقی پسند نقاد) کی سوچ اور اپروچ میں بلا کا توازن ہے۔ وہ ادب کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ جوش وفراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد کے زیرِ اہتمام ایک ادبی رسالہ ''جوش بانی'' کا شمارہ ۵۔۶ جولائی ۲۰۱۰ تا جون ۲۰۱۱ء ترقی پسند نظم نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ اس میں آٹھ مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین ترقی پسند ادب، خصوصاً ترقی پسند شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس نمبر کا سب سے اہم حصہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اس میں ۵۹ شعرا کی ۷۱ نظموں کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ ۱۱۴ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس نمبر کے اداریہ میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''بہت پہلے میں نے میراجی کی کتاب اس نظم میں پڑھی تھی جو بہت اچھی لگی تھی، بس اسی طرز پر ترقی پسند نظم اور ان کے تجزیوں کا خاکہ بنا ڈالا۔''(۸۲)

حیدر قریشی اسے آزادانہ علمی وادبی کام کرنے والوں کے کام کے ایماندارانہ اعتراف کی ایک جہت قرار دیتے ہیں۔ عمومی طور پر تو ترقی پسندوں کی طرف سے میراجی کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے میراجی کے لکھے ہوئے دو تجزیے اور میراجی کی نظم ''کلرک کا نغمۂ محبت'' کا تجزیاتی مطالعہ کرا کے اس نمبر کی زینت بنایا ہے۔ ترقی پسندوں کی طرف سے یہ ایک صحت مند تبدیلی ہے امید ہے اس نمبر سے ادب میں فراخدلانہ سوچ اور صحت مند رویے مستحکم ہوں گے۔

''میراجی، شخصیت اور فن'' ڈاکٹر رشید امجد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ حیدر قریشی صاحب نے مقالے کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ حیدر قریشی رقمطراز ہیں:

''میں سمجھتا ہوں جدید نظم میں میراجی جتنی اہم شخصیت ہیں۔ رشید امجد افسانے میں لگ بھگ اتنی ہی اہم شخصیت ہیں۔۔۔ رشید امجد کا جدید افسانے کے حوالے سے جو کام ہے وہ میراجی کے جدید نظم والے کام جتنا ہی اہم ہے۔ شاید اس لیے رشید امجد نے نہ صرف دستیاب معلومات سے استفادہ کیا ہے بلکہ میراجی کو جدید ادب کے باطنی حوالوں سے بھی عمدگی سے دریافت کیا ہے۔''(۸۳)

ان کے مطابق پہلا باب اس مقالے کا اہم ترین حصہ ہے اس میں میراجی کے خاندانی، سوانحی اور شخصی حالات پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرا باب میراجی کی نظم نگاری سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں میراجی کے گیتوں اور غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں تنقید اور پانچویں باب میں میراجی کے تراجم کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ چھٹا باب میراجی کی نثر سے

متعلق ہے،حیدر قریشی اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس باب کے مطالعے سے مجھے پہلی دفعہ علم ہوا کہ میراجی نے حالاتِ حاضرہ اور سماجی موضوعات پر بھی فکر انگیز مضامین لکھے تھے۔وہ علمِ فلکیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ساتویں باب میں میراجی کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے۔ان کے خیال میں میراجی سے متعلق مقالہ تحریر کرتے ہوئے رشید امجد نے انتہائی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔تحقیق کے تقاضوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔مختلف اور متضاد آرا کو بھی یکجا کیا ہے اور اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔انہوں نے میراجی کی نظم کی انفرادیت کے جو گیارہ نکات بیان کیے ہیں وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ اس رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ:

> ''میراجی کے عہد کے نظم نگاروں میں اور بعد میں آنے والے بیشتر اہم نظم نگاروں میں بھی اس لحاظ سے منفرد مثال ہیں کہ تخلیقی لحاظ سے جتنی ان کی نظمیں اعلیٰ پائے کی ہیں۔اتنی ہی ان کی غزلیں بھی اعلیٰ پائے کی ہیں۔یہ الگ بات کہ انہوں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں۔'' (۸۴)

رشید امجد صاحب نے کمالِ تخلیقی اور تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے حیدر قریشی رشید امجد صاحب کی تصنیف ''میراجی: شخصیت اور فن'' کو میراجی کی ادبی حیثیت پر دستاویزی نوعیت کا اہم اور یادگار کام سمجھتے ہیں۔یہ کتاب میراجی سے بھرپور ملاقات کرانے کا ایک وسیلہ ہے۔اس شمارے کا آخری حصہ ''انتظاریہ'' کے عنوان سے ہے۔اس میں صرف ایک مضمون ''میراجی: سو برس کی عمر میں'' شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔یہ ایک اہم اور پُرمغز مقالہ ہے۔انہوں نے میراجی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے،انھوں نے میراجی سے متعلق دستیاب تنقیدی مواد کی جانچ پڑتال کرکے اس میں ضروری اضافے بھی کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میراجی کے لیے حال اور ماضی زیادہ معتبر تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ 'ذہنی زندگی' بسر کرتے تھے،یہ نہیں کہ ان کی توجہ کا دائرہ بہت کم تھا اور وہ صرف لمحہ موجود کے لیے زندہ رہتے تھے۔اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی واردات اور ظاہری واردات کو ہر طرح چھان بین کرکے دیکھتے اور اس میں شاعری کے اِمکانات تلاش کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ میراجی (اور باتوں کے علاوہ) حواسِ خمسہ کا تجربہ اور اظہار کرنے میں ہمارے تمام شاعروں سے آگے ہیں۔'' (۸۵)

فاروقی صاحب ''میراجی'' کو اردو ادب کا "Keats" سمجھتے ہیں۔ان کا مؤقف ہے کہ میراجی سے متعلق جو تحریریں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ان میں میراجی کی شخصیت کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش تو ملتی ہے لیکن ان کی شاعری پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ان کی ذاتی کمزوریوں کا ذکر تو خوب خوب ہوا لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کم ہی ملتا ہے۔ان کے خاکہ نگاروں میں محمد حسن عسکری واحد خاکہ نگار ہیں جنھوں نے میراجی کی شخصیت کی گہرائی تک پہنچنے کی سعی کی۔فاروقی صاحب ''امیش ماتھر'' کے میراجی پر لکھے جانے والے مضمون کو عمدہ خیال کرتے ہیں (جو کہ ماہنامہ آج کل، دہلی، دسمبر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔)

اقبال کے فوراً بعد جو شعراء آسمانِ شاعری پر نمایاں ہوئے، فاروقی صاحب ان میں میراجی کو سب سے اوپر رکھتے ہیں،اس کے بعد راشد، اختر الایمان، مجید امجد اور فیض کے نام آتے ہیں،ان کے نزدیک اس کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ میراجی نے اپنے بعد کے شعرا، نقادوں اور افسانہ نگاروں پر جو اثر ڈالا وہ راشد، اختر الایمان، مجید امجد اور فیض کے اثر سے زیادہ وسیع اور پائیدار تھا۔
۲۔ میراجی کے یہاں موضوعات اور تجربات میں وسعتِ نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ اُس نے شعری ہیئت کے نئے امکانات کو دریافت بھی کیا اور وسعت بھی دی۔

فاروقی صاحب یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ شاعر میراجی اور نقاد میراجی کے ساتھ ساتھ مترجم میراجی اور مدیر میراجی کے کارناموں پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ قافیوں کی تازگی اور بے باک تنوع جو آج تک ظفر اقبال اور عادل منصوری برت رہے ہیں۔ان کی اصل میراجی کے ہاں نظر آتی ہے۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میراجی کے کلام میں اشکال اور ابہام کا شکوہ تو بہت کیا جاتا ہے مگر ان کی درست تفہیم اور تعبیر کی کوشش نہیں کی جاتی۔

وہ میراجی کی دو نظموں ''رس کی انوکھی لہریں'' اور ''بعد کی اُڑان'' کا تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔یہ تجزیے تفہیمی ہونے کے ساتھ ساتھ تجزیاتی بھی ہیں وہ میراجی کی نظم ''بعد کی اُڑان'' کو ''رس کی انوکھی لہریں'' کا تکملہ بتاتے ہیں۔وہ میراجی کی ۱۶ نظموں ''آبگینے کے اس پار ایک شام''، ''افتاد''، ''انجام''، ''بعد کی اڑان''، ''بلمپت''، ''جاتری''، ''جنگل میں اتوار''، ''رس کی انوکھی لہریں''، ''ریل میں''، ''سمندر کا بلاوا''، ''مجھے گھر یاد آتا ہے۔''محرومی''، ''ناگ سبھا کا ناچ''، ''یگانگت''، ''آوازیں'' اور ''تذبذب'' کو جدید شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور انہیں ایک متنوع اور بھرپور شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

اس شمارے میں میراجی کی شاعری کا انتخاب بھی حیدر قریشی کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس شمارے کا لائق توجہ حصہ وہ ہے جس میں میراجی کی شاعری کے انگریزی، جرمن، روسی، ڈچ، اطالوی، عربی، ترکی اور فارسی زبان میں تراجم پیش کیے گئے ہیں یہ حصہ اس شمارے کی قدر و قیمت کو دوچند کر رہا ہے۔اس شمارے میں میراجی کی نثر کا انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔نثری مضامین میں روانی، بے باکی اور ادبی سچائی قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔ایک حصے میں میراجی کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔یہ شمارہ ''میراجی شناسی'' کے نئے نئے دریچے وا کرتا ہے۔یہ ایک جاندار اور وقیع شمارہ ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
